آ بیل مجھے مار!

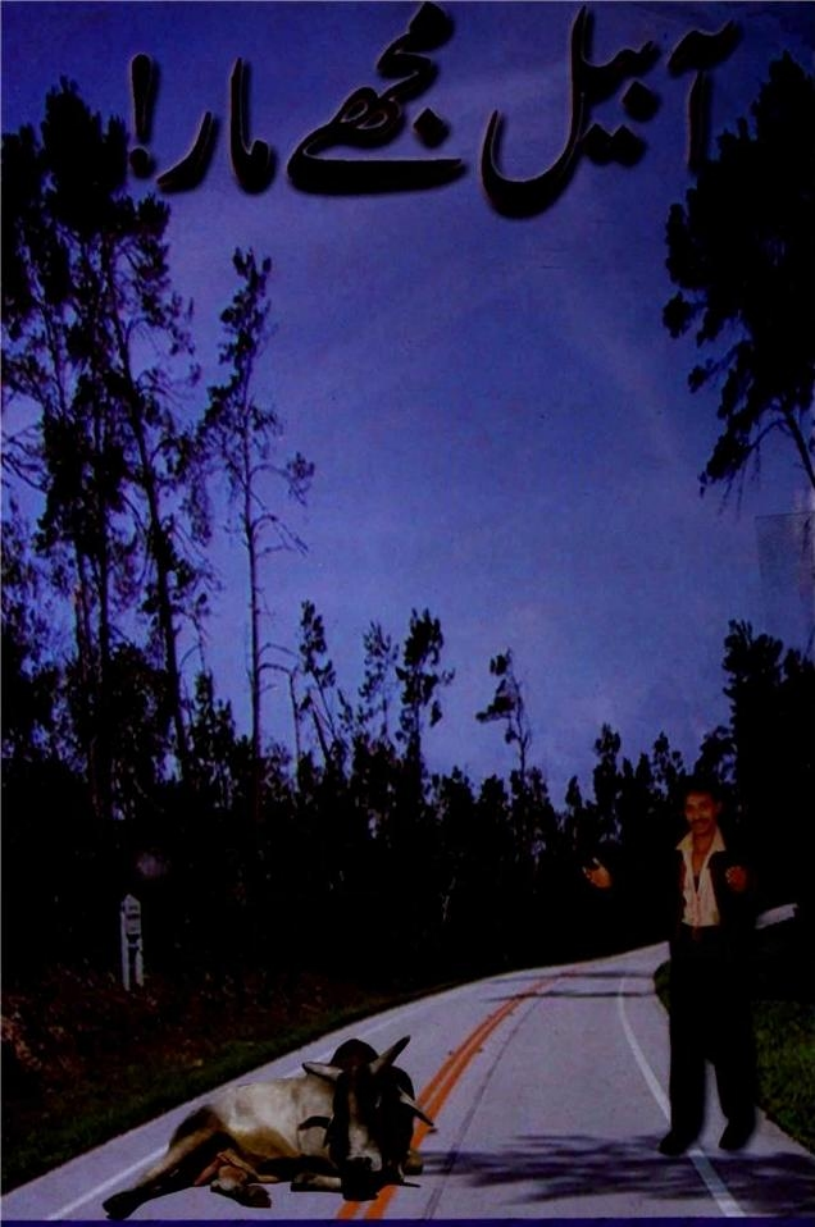

منیر ارمان نسیمی

وسیم القادری

چیف ایڈیٹر، سہ ماہی ''روزن'' بھدرک

''..... میں **منیر ارمان نسیمی** کو اُس وقت سے جانتا ہوں جب وہ ''خاکی نسیمی'' ہوا کرتے تھے۔ اُن کی کوئی تخلیق ماہنامہ 'شاعر' میں دیکھی تھی جس نے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ بھی اور..... میں بھی بھدرک کے ہوتے ہوئے بھی ہماری پہلی ملاقات دہلی میں ہوئی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ملاقات کا سلسلہ دراز ہوا۔ اُن کی تخلیقات ادبی رسائل و جرائد میں اور انٹرنیٹ پہ دیکھتا رہتا ہوں، خصوصاً..... انشائیے۔ جو کہ ہندوستان میں، جہاں تک میں جانتا ہوں یا میرا مطالعہ ہے، نئے لکھنے والے بہت کم آئے ہیں۔ **منیر ارمان نسیمی** کے ہر انشائیے میں ایک مسیج چھپا ہوتا ہے اور وہ مسیج زمانہ حال کے تمام ضرورتوں کا احاطہ کرتا ہے۔ محاورے اور روزمرہ کے حسن استعمال اور عوامی زبان کے بے دریغ تصرف سے ہرگز نہیں چوکتے۔ چھوٹی سے چھوٹی بات سے کوئی بڑا مضمون پیدا کرنا یقیناً **منیر ارمان نسیمی** جیسے فنکاروں کا طرۂ امتیاز ہے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

۷۸۶

Padmashree
BEKAL UTSAHI
Ex-Member Of Parliament
(Rajya Sabha)

Mob: 9415120838
Tel.: 05263-32369
Mob.: [illegible]
"SUGHRA ROSE"
BALRAMPUR (U.P.)
PIN-271201

- بے نیاز انشائیے -

منیر ارمان نسیمی کے تین چار انشائیے پڑھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔ ابھی کچھ برسوں سے غزلیں نظمیں نعتیں کہتا تھا۔ اچانک ایسے انشائیے جو کلاسیکل ادب کی مثال ہیں لکھنا ارمان نے دنیا وطیرہ بنا لیا۔ سماج کے کھردرے موضوع پر بڑی بیباکی اور بے ساختگی سے نثر نگاری کر کے ناقدین و مبصرین کی چشم خرد کو چکا چوند کر دیا۔ منیر ارمان نے ہمارے سماج کی خود بینی، مجبوری، بے بسی کا خاکہ کھینچا۔ مشکل کاموں کو آسان کر دکھایا منیر ارمان نے — ملک اور پڑوسی ملکوں کے نثر نگاروں کو متوجہ کیا ہے۔ سادگی میں معنویت، افسانے میں حقیقت اجاگر کیا ہے۔ ان کے انشائیے پڑھ کر وہ تمام تصویریں آئینہ دکھاتی ہیں قارئین کو — منیر ارمان نے جو راستہ اختیار کیا انھیں جلد ہی منزل عظمت و شہرت مل جائے گی۔ میری دعائیں اور جشن فتح کے لئے۔

فقیر بیکل اُتساہی غفرلہ
بلرامپور
۲۹ر اکتوبر ۰۹ء

کٹیا کی قسمت

شہر کے تمام ماہر ڈاکٹروں کی ٹیم گول ٹیبل کے گرد سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر اس طرح اچانک ایک ہنگامی میٹنگ کی کیا ضرورت آن پڑی کہ ہیلتھ منسٹر صاحب نے انھیں بلوا بھیجا؟ ضرور کوئی بیحد سنجیدہ مسئلہ ہوگا، کوئی ایسی بات جس سے صوبے کے عوام کی صحت وزندگی پہ گہرا اثر پڑنے والا ہوگا اور انہیں اس ناگہانی آفت سے بچانے کے لئے منسٹر صاحب نے ہمیں بلوایا ہوگا۔ جتنی منھ اتنی بات، جتنی سوچ اتنی الجھن! آخر کار ایک ڈاکٹر، جو شہر کا سب سے بڑا ہارٹ اسپیشلسٹ تھا اور جس کو آج دو ہارٹ آپریشن بھی کرنے تھے، زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکا اور ہیلتھ سکریٹری سے پوچھ بیٹھا..... ''سَر! اِف یو ڈونٹ مائنڈ، کیا آپ ہمیں بتائیں گے کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ کونسی ایسی مصیبت آپڑی جو منسٹر صاحب اتنے پریشان ہوگئے ہیں اور ہمیں فوراً پہنچنے کی ہدایت ملی ہے؟ اس میٹنگ کا ایجنڈا کیا ہے؟؟ ہیلتھ سکریٹری نے اُس ڈاکٹر کو گھور کر دیکھا پھر ایک شریر مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پہ کھیلنے لگی بولے..... ''ڈاکٹر مالپانی جی! ہمیں پتہ ہے کہ آج آپ کے دو کروڑ پتی کلائنٹ کا ہارٹ آپریشن ہے، لاکھوں کا سودا ہے مگر بسواس کریں مجھے خود بھی حیرت ہے کہ منتری جی نے یہ میٹنگ کیوں بلوائی ہے؟ صبح سویرے فون آیا اور منتری جی نے مجھے بلا کر کہا کہ شہر کے جتنے بھی اچھے ڈاکٹر ہیں سب کو اُٹھوالو..... مجھے ان سے بات کرنی ہے''۔ میں نے آپ لوگوں کو بُلوالیا۔ اب آپ انتظار کریں۔ منتری جی اپنی بکری کو نہلا رہے ہیں، بس تھوڑی دیر میں حاضر ہونے والے ہیں، ان کے منھ سے ہی سن لینا۔

آدھا گھنٹہ کے بعد ہیلتھ منسٹر شری گجیندر پرساد جی اپنے چیلے چمچوں کے ساتھ میٹنگ میں وارد ہوئے۔ ڈاکٹروں نے کھڑے ہوکر نمسکار کیا اور منتری جی نے سر ہلا ہلا کر ان کا ابھیوادن قبول کیا۔ موبائل پہ کسی سے بات کر رہے تھے، چہرے پہ پریشانی کی ان گنت

لکیروں نے ان کو اور بھی کالا کر دیا تھا۔ ڈاکٹروں کا حال خراب کہ پتہ نہیں یہ خَر دماغ منتری کونسا اوٹ پٹانگ آرڈر دیدے۔ منتری جی کے بیٹھنے کے بعد سب ڈاکٹروں نے اپنا اپنا آسن گرہن کیا اور منتری جی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتے رہے۔ منتری جی کا موبائل خاموش ہوا تو ان کو ہوش آیا کہ یہ ڈاکٹر لوگ پچھلے تین گھنٹے سے انتظار میں سوکھ رہے ہیں۔ وہ شرمندہ ہونے کے بجائے اپنے سکریٹری کے اوپر برس پڑے ''کیا بات ہے مالیسکر بابو..... آپ تو سچ مچ بابو بن گئے ہیں، یہ ڈاکٹر لوگوں کو کچھ کھانے پینے کو دیا کہ نہیں، سب کے چہرے اجڑے ہوئے کیوں ہیں؟''۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر جو منتری جی کا ذاتی ڈاکٹر تھا بولا..... ''نہیں منتری جی، ایسی بات نہیں ہے، مالیسکر جی نے تو پانچ چھ بار چائے پلادی ہے۔ ہمارے چہرے پر چھائی اُداسی کا کارن کچھ اور ہے۔ ہم آپ کی صحت کے لئے پریشان ہیں۔ آپ چوبیسوں گھنٹے دیس سیوا کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں اور اس کا اثر آپ کی صحت پہ پڑ رہا ہے۔ آپ تو سوکھ کر کانٹا ہو گئے ہیں اور آپ کی آنکھوں کے نیچے کالے دھبّے بتا رہے ہیں کہ آپ کئی دنوں سے ٹھیک طرح سوئے بھی نہیں ہیں۔ ایسے میں ہم کیسے خوش رہ سکتے ہیں بھلا''۔

منتری جی اپنی جھوٹی تعریف سے خوش ہو گئے۔ بولے..... ''بھئی! ہم تو جنتا کی چنتا میں رات دن گھلتے رہتے ہیں۔ جنتا بھی کر دو جنتا خوش نہیں ہے کہتی ہے ہم منتری لوگ سب اپنے لئے کر رہے ہیں۔ یہ جو ہم ہسپتال وغیرہ بنوا کر دیئے ہیں کیا صرف اپنے لئے؟ پبلک کا ہے سمجھتی نہیں ہے کہ ہم ان کے دکھ سکھ کے ساتھی ہیں۔ کسی نے ہمارے اوپر کیس ٹھونک دیا ہے اور یہ CVC والے ہم کو چار پانچ دنوں سے سونے نہیں دے رہے ہیں۔ آئے دن ہماری کوٹھیوں پہ چھاپہ، ہماری فیکٹری پہ چھاپہ، بنگلے پہ چھاپہ..... اب ہم آرام کریں تو کیسے کریں؟ اب آپ ہی بتاؤ کہ اگر فیکٹری بند ہو گئی تو ہزاروں مزدوروں کے گھر میں چولہا کیسے جلے گا؟ ان کے پریوار والے کھائیں گے کیا؟ یہی سب سوچ سوچ کر ہماری صحت گرتی جا رہی ہے''۔

ڈاکٹروں نے سوچا کہ یہی اچھا موقع ہے۔ جلدی سے منتری جی کے لئے ہمدردی ظاہر کر کے، کچھ دوائیاں تجویز کر کے بھاگ لیتے ہیں۔ اس منتری کا کچھ ٹھیک نہیں کہ کب کونسا

حکم دیدے۔ ڈاکٹر مکھر جی بولے..... ''منتری جی اگر آپ کے پاس تھوڑا سا فالتو وقت ہو تو ہم آپ کے پورے بوڈی کا چیک اپ کریگا اور دو تین دن میں آپ یکدم پہلے کے مافق چنگا ہو جائیگا۔'' دوسرے ڈاکٹر کہاں چپ رہنے والے تھے آخر ہیلتھ منسٹر کی صحت کا سوال ہے۔ ڈاکٹر قریشی کھڑے ہو گئے اور بولے ''منتری جی! میں مریض کو دیکھ کر بتا دیتا ہوں کہ اس کو کیا بیماری ہے؟ چیک اپ وغیرہ میں وقت برباد کرنے سے اچھا ہے کہ آپ فلاں فلاں دوا..... صبح کھانے کے بعد دو چمچ، دوپہر کو لنچ کے بعد دو چمچ اور پھر رات کو سونے سے پہلے دو چمچ لے لیں..... دو دن میں اگر آپ کی صحت ٹھیک نہیں ہوئی تو میرا نام بدل دیجیئگا''۔ منتری جی بولے..... ''ارے قریشی بھائی رہنے دو..... اتنے چمچے میں کہاں سے لاؤنگا..... روز چھ چمچ؟ ارے باپ رے..... آپ بیٹھو اور میری نہیں میری جُولیا کی صحت کے بارے میں سوچو۔ جس کے لئے میں نے آپ سب کو یہاں بلوایا ہے''۔

جُولیا.....؟؟؟ سب ڈاکٹروں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ کون ہے یہ جولیا منتری جی؟ ''کیا بات ہے مالیسکر بابو..... آپ نے ان لوگوں کو نہیں بتایا کہ جولیا کون ہے اور ہم کل رات سے اس کے لئے کیوں پریشان ہیں؟؟ آپ کام کرنے کے لئے ہیں کہ ہمارے پیچھے پیچھے دُم ہلانے کے لئے؟ آپ کو IAS کا سرٹیفکٹ کس بیوقوف نے دیدیا؟'' منتری جی کی جھڑکی سن کر مالیسکر بابو کی ہوا نکل گئی۔ وہ بیچارے کیا جانیں کہ منتری جی نے سب ڈاکٹروں کو کیوں بلوایا ہے؟ ہاں کل رات منتری جی کے گاؤں سے ان کی دھرم پتنی نے فون کیا تھا کہ اُن کی بلاتی (ولایتی) کُتیا جُولیا کا پیٹ پھول رہا ہے اور وہ راتوں کو سوتی نہیں ہے اور نہ کسی کو سونے دیتی ہے بس روتی رہتی ہے۔ یہ بیماری پچھلے مہینے سے ہوا ہے مگر اب پیٹ پھول کر ڈھول کی طرح ہو گیا ہے۔ جلدی کچھ نہیں کیا گیا تو شاید کل پرسوں تک پھٹ جائیگا۔

یہی بات مالیسکر بابو نے جلدی جلدی سب ڈاکٹروں کو بتائی۔ سب کے سب پریشان لگنے لگے کہ آخر منتری جی کی کُتیا کو کیا ہوا ہوگا؟ منتری جی نے کہا کہ..... ''آپ سب شہر کے مانے ہوئے ڈاکٹر ہو، جلدی سے میری جولیا کا علاج سوچو ورنہ سب کو نکسلی علاقے

میں ٹرانسفر کردونگا۔ میں اپنی جولیا کی آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں کرسکتا''۔ کہتے کہتے منتری جی کی آواز بھیگ گئی جیسے جولیا کوئی کتیا نہیں بلکہ ان کی فیملی ممبر ہو..... ان کا کوئی خونی رشتہ ہو اس کے ساتھ۔ آج کے اس دور میں جہاں انسان، انسان کے خون کا پیاسا ہے ایک جانور سے منتری جی کی محبت..... قابل تعریف نہیں بلکہ قابل پرستش ہے۔ ہمیں بھی چاہئے کہ ہم انسانوں کے بجائے کتوں سے، بلیوں سے، سانپوں سے اور اگر ہو سکے تو کیچوے سے بھی محبت کریں تاکہ آنے والے دنوں میں تاریخ ہمیں حیوانوں کے مسیحا کے طور پر یاد رکھے!

منتری جی بھیگی پلکوں کے ساتھ لنچ کرنے کے لئے اپنے کیبن میں جانے سے پہلے ڈاکٹروں کی ٹیم کو چیتاونی دے گئے کہ آپ لوگ جم کر کھانا کھائیں..... جتنا کھا سکتے ہیں کھائیں مگر جلدی سے میری جولیا کو اچھا کرنے کا اُوپائے بتائیں ورنہ.....؟؟؟ اسی بات کا ڈر تھا ڈاکٹروں کو کہ کچھ نہ کچھ اوٹ پٹانگ بات ہو کر رہیگی۔ کوئی ہارٹ کا، کوئی کڈنی کا، کوئی کان، ناک کا، کوئی دانت کا تو کوئی چمڑے کا ماہر ڈاکٹر تھا مگر..... ان کو یہاں کتیا کے علاج کے لئے کہا گیا ہے۔ اب اس کے لئے کسی vetenary ڈاکٹر کو بلانا تھا۔ یہ گھنٹی بلّا کو پہنائے کون؟ سب ڈاکٹروں نے چکن بریانی کھاتے ہوئے اپنے بچاؤ کا راستہ ڈھونڈ نکالا کہ تھوڑی تفریح بھی ہو جائیگی اور منتری جی بھی خوش کہ شہر کے مانے ہوئے ڈاکٹروں کا قافلہ..... ان کی کتیا کے علاج کے لئے دوسو کلومٹر دور انکے گاؤں تک پہنچا۔ علاقے میں ان کے دھاگ کی آگ لپلپانے لگے گی کہ واہ..... کیا بات ہے، منتری تو منتری ان کی کتیا کے لئے بھی ڈاکٹر راجدھانی سے آرہے ہیں۔

مالیسکر بابو کو یہ بات اس لئے پسند آئی کہ ان کا گھر بھی منتری جی کے گاؤں میں ہے اور پچھلے سال سے وہ ایک بار بھی بیوی بچوں سے ملنے نہیں جاسکے تھے اور یہ اچھا موقع تھا۔ منتری جی کو رام کرلینا مالیسکر بابو کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ڈاکٹروں کا قافلہ مع منتری جی کے دن کے تین بجے راجدھانی سے نکلا اور شام کو ان کے گاؤں پہنچ گیا۔ منتری جی کی میڈم بلبلاتی ہوئی باہر آئیں اور..... جولیا..... جولیا کہہ کے ان سے لپٹ گئیں۔ منتری جی نے

سمجھا کہ ان کی جولیا شاید مر گئی، انہوں نے اپنی پتنی کو دھکا دیکر اپنے سے الگ کیا اور دوڑے جولیا کے کوارٹر کی طرف۔ جولیا جو چت لیٹی ہوئی سسک رہی تھی منتری کو پہچانتے ہی اٹھ کے دوڑی ان سے لپٹ جانے کو مگر گلے میں پڑا زنجیر دیوار بن کے کھڑا ہو گیا۔ منتری جی نے مالیسکر بابو سے کہا..... ''دیکھا مالی..... جولیا ہم کو تمری بھابی سے بھی زیادہ پیار کرتی ہے، اس کی زنجیر جلدی کھول دو اور ڈاکٹر لوگوں کو کہو کہ فوراً اس کا چیک اپ شروع کر دیں''۔

تمام ڈاکٹروں نے ادھر ادھر ٹٹول کر دیکھا۔ ڈاکٹر قریشی نے تو کتیا کا بلڈ پریشر بھی چیک کر دیا اور تھرمامیٹر گھسانے والے تھے کہ انھیں یاد آیا کہ..... جولیا کوئی حسین لڑکی نہیں منتری جی کی کتیا ہے، اگر کاٹ لیگی تو چودہ انجکشن خود کو لگوانے پڑ جائیں گے۔ اچھی طرح چیک اپ کرنے کے بعد..... سب ڈاکٹر سر جوڑ کر بیٹھے کہ کریں کیا؟ مالیسکر بابو کو بلوایا گیا اور ڈاکٹروں نے ان کو انگریزی میں سمجھایا کہ..... ''منتری جی کی کتیا کو کچھ نہیں ہوا ہے..... وہ حمل سے ہے اور ولادت آجکل کے اندر کبھی بھی ہو سکتی ہے''۔ مالیسکر بابو یہ بات سُن کے..... سر پکڑ کر دھپ سے زمین پر بیٹھ گئے جیسے یہ سب کے ذمے دار وہ خود ہی ہوں۔ فکرمندی سے بولے..... ''اب کیا ہوگا؟ منتری جی کو یہ بات آپ لوگ کیسے بتائیں گے؟؟ ان کی جولیا کو کس نے.....؟؟ جئے سیا رام، مجھے اس سنکٹ سے بچاؤ کوئی راستہ بتاؤ۔ منتری جی تو اپنی بلاتی کتیا کے پاس کسی گاؤں والے تک کو جانے نہیں دیتے تھے پھر وہ کون سا سر پھرا دیسی کتا تھا جس نے جولیا کی یہ دُرگت کر دی؟ اب اس میں جولیا کی مرضی بھی شامل ہو سکتی ہے..... مگر منتری جی کو سمجھائے کون؟؟؟ وہ تو اپنی جولیا کے pregnancy کا سن کے پاگل ہو جائیں گے۔ کیا پتا گاؤں کے تمام کتوں کو پکڑوا لانے کی ضد کر بیٹھیں۔ ہو سکتا ہے کہ بیچارہ گودھو (جولیا کا کیئر ٹیکر، جس نے اُس کا کیئر ہی نہیں لیا)..... منتری جی کے ہاتھوں سورگ باسی ہو جائے۔''

مالیسکر بابو سر پکڑے پکڑے سوچتے رہے اور پھر انہوں نے ڈاکٹروں کو ہدایت دی کہ ابھی آپ لوگ منتری جی سے کہہ دیں کہ جولیا کو کیا ہوا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے..... ہم آپس میں رات بھر چرچا کریں گے، کل صبح آپ کو بتائیں گے کہ کیا کرنا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ جولیا

کو راجدھانی لے جانا پڑے۔ اور یہی بات ڈاکٹروں نے منتری جی سے کہہ دی اور انہوں نے بھی کہہ دیا کہ..... ''ٹھیک ہے آپ سب ہمارے گیسٹ ہاؤس میں رہو..... کھاؤ، پیو، عیش کرو مگر میری جولیا کو جلدی اچھا کرو۔ جب تک وہ اچھی نہیں ہوگی..... آپ لوگ ہمارے مہمان رہو گے۔'' ڈاکٹروں کی ٹیم اور مالیسکر بابو سر جوڑ کے بیٹھ گئے کہ کیا کیا جائے؟؟؟ ڈاکٹر قریشی نے سُجھاؤ دیا کہ..... ''ہم ایسا کرتے ہیں کہ رات کو چپکے سے جولیا کو بیہوش کر کے یہاں لے آتے ہیں اور اس کا آپریشن کر کے بچے نکال لیتے ہیں..... اس کے بعد پھر جولیا کو لے جا کے اس کے کوارٹر میں سُلا دیں گے۔ صبح ہوگا تو جولیا کا پھولا پیٹ اور منتری جی کی پریشانی دونوں غائب''۔ ڈاکٹر منکھر جی بگڑ گئے..... ''ارے یار تم ڈاکٹر ہو کہ قصائی..... اٹھا لیں گے، پھاڑ دیں گے، بچہ نکال کر سلائی کر دیں گے۔ اور صبح ہوتے ہی جولیا جب ہوش میں آئے گی، درد سے چھٹپٹائے گی، اپنے بچوں کو ڈھونڈے گی..... چلائے گی، شور مچائیگی تو..... ہم سب کہاں منہ چھپائیں گے؟؟؟''۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر قریشی اور ڈاکٹر منکھر جی میں تو تو میں میں حد سے آگے بڑھتی ڈاکٹر مالپانی نے کہا..... ''بھگوان کے لئے آپ لوگ بچوں کی طرح لڑنا جھگڑنا بند کرو۔ اور آپ سب لوگ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ منتری جی کو سچ بتا دیں کی ان کی جولیا ماں بننے والی ہے (اور وہ نانا)۔ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ یہ ایک فطری تقاضہ ہے کہ بھادوں کے مہینے میں جب جنس کی بھوک ستاتی ہے تو کتیا کے بدن سے ایک شہوانی خوشبو..... کتوں کو اسکے پیچھے پیچھے دُم ہلانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ کُتے دن دن بھر اس کے پیچھے بھاگتے ہیں اور لذت وصل کے فراق میں رہتے ہیں۔ موقع ملتے ہی ٹوٹ پڑتے ہیں۔ منتری جی کی جولیا کو بھی کسی دیہاتی کتے سے پیار ہو گیا ہوگا اور اس پیار کی نشانی کی وجہ سے اس کا پیٹ پھولا ہوا ہے۔ بات ختم!''

ایک نوجوان ڈاکٹر جواب تک چپ چاپ تھا بولا..... ''آپ سب لوگ کچھ دیر کے لئے اس ٹاپک کو کلوز کریں گے پلیز۔ آج صبح سے کتیا، جولیا، کُتیا، جولیا کرتے کرتے دماغ پک گیا ہے۔ پہلے کچھ دیر ٹی۔ وی دیکھتے ہیں۔ کچھ میوزک سیوزک سُنتے ہیں..... راکھی، ملیکا

کے ساتھ ٹھمکے لگاتے ہیں..... فریش ہوتے ہیں۔ ڈنر لینے کے بعد فریش دماغ سے سوچیں گے تو فریش آئیڈیا نکلے گا''۔ سب کو اس فریش ڈاکٹر کی بات اچھی لگی اور سب ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھاتے رہے اور سامنے اسکرین پہ چل رہی میوزک ویڈیوز دیکھتے رہے۔ کمرشیل بریک کے دوران نیوز چینل پہ بریکنگ نیوز بھی دیکھ لیتے تھے۔ آخر مالیسکر بابو..... ہیلتھ منسٹر کے سکریٹری ہیں کوئی عام افسر تو نہیں۔

پھر کمرشیل بریک آیا، مالیسکر بابو نیوز چینل کو پلٹ آئے اور اچانک اتنے زور سے چونکے کہ ڈاکٹر لوگ بھی ہوشیار ہو گئے۔ انڈیا ٹی۔ وی کے بریکنگ نیوز میں رپورٹر بول رہا تھا..... ہیلتھ منسٹر کے چار کوٹھیوں اور چھ فیکٹریوں سے CVC کو تقریباً تیس کروڑ کی نقلی دوائیں، انجکشن وغیرہ ملی ہیں اور ہیلتھ منسٹر راجدھانی سے غائب ہیں۔ ان کو گرفتار کرنے کے لئے ایک پولس ٹیم جگہ جگہ چھاپے ڈال رہی ہے۔ چیف منسٹر صاحب نے ہیلتھ منسٹر کو اپنی کابینہ سے نکال دیا ہے اور ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ خود اپنے پاس رکھ لیا ہے اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ..... ''مجرم چاہے کوئی بھی ہو، میرا سگا بھائی بھی کیوں نہ ہو..... بچ نہیں سکتا۔ قانون اپنی جگہ ہے اور سب کے لئے برابر ہے''۔

یہ خبر سنتے ہی مالیسکر بابو اٹھ کر ناچنے لگے اور پھر ڈاکٹر لوگوں سے بولے..... ''ہماری جان بچ گئی۔ اب منتری جی کی جان پھنسنے والی ہے۔ اس سے پہلے کہ پولس ٹیم یہاں پہنچے اور منتری جی کے ساتھ ساتھ مجھے اور آپ کو بھی گرفتار ہونا پڑے..... یہاں سے فوراً رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ ہیلتھ منسٹر گیا بھاڑ میں..... اسے سونے دو..... اب وہ جیل میں بیٹھ کر اپنی کٹیا کے پیٹ کا ماتم کریگا''۔ پھر ڈاکٹر لوگ اپنی اپنی کار میں بیٹھ کر مالیسکر بابو کی رہنمائی میں ایک ذیلی راستے سے راجدھانی کو لوٹ آئے۔ لوٹتے وقت انھیں گاؤں کے منڈیر تک..... منتری جی کی کٹیا کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اب کی بار اسکے رونے کی آواز میں بڑا درد تھا..... اپنے مالک سے بچھڑنے کا غم شامل تھا شاید.....!!

☆☆☆

زہریلے پتے

ہم میں سے اکثر لوگوں کے پاس، اپنی اپنی نجی ڈائری ہوتی ہے۔ جس میں ہم روزنامچہ لکھتے ہیں۔ یہ بھی شاید انگریزوں کی دین ہے مگر آج تک ہم یہ بات نہیں سمجھ سکے کہ اس کا فائدہ کیا ہے؟ جب ہم اُس کو چھپا کر رکھتے ہیں تو لکھتے کس کے لئے ہیں؟ ہم اپنی ڈائری میں وہ باتیں بھی لکھ ڈالتے ہیں جنھیں کسی سے کہنے کی ہمت نہیں جُٹا پاتے۔ وہ پوشیدہ راز، تعلقات یا خرافات جن کو اگر کوئی پڑھ لے تو ہم ننگے ہو جائیں وہ بھی ہم ڈائری میں قلم بند کر جاتے ہیں۔ ہم یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ ایک دن ہم مر جائیں گے تو وہ ڈائری ہمارے سگے، بھائی برادر کے ہاتھ لگے گی تو اُسے پڑھ کر اُن پر کیا گزرے گی؟ کبھی کبھی ہمارے جیتے جی بھی وہ ڈائری پولس، سی بی آئی، انکم ٹکس والوں کے ہاتھ لگ جاتی ہے اور ہم ..... رومال سے، ٹاول سے یا پھر اپنے کُرتے کے کالر سے منھ چھپائے جیل جاتے ہیں مگر ہمارے گھر والے، رشتے دار، سگے سمبندھی کیا کریں؟ کہاں جائیں؟؟ کس کس کو بتائیں گے رُسوائی کا سبب ہم!

آج ہم ایسے ہی چند ایک معزز لوگوں کی نجی ڈائری کے چند اوراق پڑھنے کا گناہ کریں گے۔ ہوسکتا ہے ہماری یہ گستاخی کسی کو بری لگے تو ہم پہلے ہی معافی کے طلبگار ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ دوسروں کا نجی خط یا ڈائری پڑھنا اخلاقی گناہ ہے مگر کیا کریں گناہ میں ایسی کشش ہے کہ کنٹرول ہی نہیں ہوتا ہے۔ اگر کوئی قاری ہماری یہ بے تکی باتیں پڑھنے کے بعد اس گناہ سے توبہ کر لے اور ڈائری پڑھنا تو دور لکھنا بھی بند کر دے تو ہم سمجھیں گے کہ ہمارا جنم سپھل ہو گیا۔

ایک بیروزگار کی ڈائری:

۶ مئی ۲۰۰۵ء (صبح ۷:۲۰): آج گھر نہ جانے کیوں سُونا سُونا کسی کھنڈر کی طرح لگتا ہے۔ سب ہیں مگر پورا ماحول گم صم۔ کوئی بولتا نہیں ہے۔ کچن سے کپ پلیٹ کی آواز بتا رہی ہے کہ ماں

جاگ چکی ہے اور چائے تیار کر رہی ہے۔ بھابی کی صبح نو بجے سے پہلے نہیں ہوگی۔ بھیا آفس جانے سے پہلے انھیں اُٹھائیں گے اور ایک گڈ بائی کس لے کر چلے جائیں گے۔ روز صبح کی چائے دیدی بناتی تھی۔ کل اس کی شادی ہوگئی۔ جب تک دیدی تھی ماں کو کچن میں جانے نہیں دیتی تھی کہ ہمارے ہوتے تم کام کروگی، اس سے بڑی شرم کی بات اور کیا ہوگی۔ مگر بھابی کی شرم کو کیا ہوگیا تھا؟ شاید بھیا کی عقل پہ پڑ گیا ہے۔ جو بھیا مجھے ڈانٹتے تھے کہ مرد ہو کر دن کے آٹھ بجے تک سوتا ہے تجھے شرم نہیں آتی وہی بھیا خود شادی کے بعد..... اپنی مردانگی گروی رکھ چکے تھے! آج دیدی کی وہ بات مجھے بہت یاد آرہی ہے۔ جب ماں نے بھیا کے لئے امیر گھر کی بیٹی ڈھونڈنی شروع کی تھی تب دیدی نے اسے سمجھایا تھا، کہا تھا..... ''ماں، اپنی چادر سے زیادہ پاؤں مت پھیلاؤ ورنہ چادر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گی۔ بھیا اگر بینک منیجر ہوگئے ہیں تو اس میں تمہارا کیا؟ مزہ تو وہ لوٹے گی جو ان کی بیوی بن کر آئے گی، عیش وہ کریگی اور تمہیں دودھ کی مکھی طرح نکال پھینکے گی''۔ پچھلے دو سال سے وہی ہو رہا ہے۔ ریٹائرڈ میجر بلونت رائے کی اکلوتی بیٹی کو بہو بنا کر..... ماں روز پیریڈ کرتی رہتی ہے اور بہورانی اپنے لانس نائک کے ساتھ قدم تال کرتی رہتی ہیں۔ اگر دیدی نہ ہوتی تو ماں کا اور..... ہم سب کا کیا ہوتا؟ اب دیدی کے بعد ماں کا کیا ہوگا؟؟ کیا میں شادی کرلوں؟؟؟ کیا گارنٹی ہے کہ میری بیوی.....؟؟؟

ایک پریمی کی ڈائری:

۲۸ جولائی ۲۰۰۵ء (رات ۱:۱۵): آج پریتی نے مجھ سے کہا..... '' آکاش مجھے بھول جاؤ۔ میرے گھر والے تمہارا رشتہ کبھی قبول نہیں کریں گے۔ تمہیں مجھ سے اچھی پریتی مل جائے گی، دیکھو ضد نہ کرو..... سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہمارے اور تمہارے اسٹیٹس میں اتنا فرق ہے کہ میرے ڈیڈ تم سے ملنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں، ایسے میں تم سے شادی کی بات..... نہ بابا نہ..... وہ تو مجھے گولی مار دینگے''۔ وہ کہتی رہی اور میں اُداس، غم زدہ ہو کر سُنتا رہا جیسے اسکے بچھڑنے کے دکھ میں ایک پل بھی جینا دشوار ہے۔ وہ رو دھو کر چلی گئی اور میں دل ہی دل میں ہنستا رہا کہ میں نے اسے

دونوں ہاتھوں سے لُوٹا تھا۔ چھ ساتِ ماہ تک مزے بھی لیا اور آخر میں دو لاکھ میں بیچ بھی دیا تھا۔ اُس کی شادی جس سے ہو رہی تھی وہ لڑکا شہر کے سب سے بڑے کپڑا مل کے مالک کا بیٹا ہے اور ریپ کیس میں جیل کی ہوا کھا چکا ہے۔ میری اُس سے دوستی جیل میں ہوئی تھی اور یہ پلان بھی میرا تھا کہ اس کے لئے پریتی کو میں پھانسونگا، جس کے بدلے وہ مجھے دو لاکھ دیگا اور..... کروڑ پتی کی اکلوتی بیٹی سے شادی کر کے اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو بچالیگا۔

آج میں بہت خوش ہوں کہ میں نے اپنا ڈیل پورا کر دیا۔ پریتی کو اپنے خوبصورت چہرے اور دلکش اداؤں سے اپنے بس میں کیا، پیار کے جال میں پھنسا کر ہوٹلوں میں، ڈسکوز میں، پارٹیوں میں لے کر گیا۔ وہاں سُنیل کو اپنا دوست بتا کر اس سے پریتی کو ملوایا۔ تمام خرچ سُنیل نے اُٹھایا اور بہتی گنگا میں ڈبکی میں نے لگائی۔ اس سے شادی کر کے اور زیادہ کیا کر لیتا؟ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ سُنیل کی دولت پر پریتی کو اپنی طرف ضرور کھینچ لیگی اور وہ مجھے دھوکہ دینے کے لئے بہ خوشی تیار ہو جائیگی۔ ہائی سوسائٹی میں اسے دھوکہ یا..... بے وفائی نہیں کہتے۔ یہ بھی محبت کی ایک ادا ہے، جو جس کو بھا گیا، وہ اُس کو کھا گیا۔ یہاں انگور کبھی کھٹے نہیں ہوتے کیونکہ چاروں طرف رنگ برنگے انگوروں کی جھاڑ ہوتی ہیں۔ تو نہیں اور سہی..... اور نہیں اور سہی!!

ایک راج نیتا کی ڈائری:

۱۵ اپریل ۲۰۰۳ء (رات ۱۰:۰۵): بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج اسپیکر مہودے نے مجھے ایوان میں سوال کرنے کا موقع دیا ورنہ کل بھاکری گروپس آف کمپنی والوں کو ایڈوانس کا پانچ لاکھ لوٹانا پڑتا، اوپر سے شرمندگی بھی اٹھانی پڑتی۔ آگے کسی کام کے لئے وہ مجھے چرکوٹ ہی سمجھتے۔ آج کل ایوان میں کچھ پڑھے لکھے نوجوان ممبران آگئے ہیں جو بال کی کھال نکالتے رہتے ہیں۔ ہم جیسے تجربہ کار راج نیتاؤں سے مشورہ تو دور، بات کرنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ہم انگوٹھا چھاپ ہوئے تو کیا ہوا؟ پندرہ سال سے راج نیتی میں ہیں، کئی اُتار چڑھاؤ دیکھ چکے ہیں بلکہ کروا چکے ہیں۔ ہمیشہ رولنگ پارٹی کے ساتھ رہ کر اپنی دھاگ جمائی ہے۔ اور یہ پڑھے لکھے لونڈے

شگفتہ شگفتہ انشائیے ترے

ڈاکٹر بلند اقبال

یہ بھی کیا بات ہے کہ سارے دن کی تھکن کے بعد جب آپ کچھ لمحے کے لیے اپنی آنکھیں بند کر کے صوفے پر ترچھے لیٹے ہوئے ہوں اور اچانک کئی دن پہلے کی پڑھی ہوئی کوئی انجانی سی تحریر آپ کے ذہن میں کسی ملائم سے خیال کی طرح اُتر آئے اور لمحے بھر میں آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جائے اور آپ ایک بار پھر سے تروتازہ ہو جائیں۔ جی ہاں جناب ..... بالکل ایسا ہی میرے ساتھ کئی بار ہوا جب منیر ارمان نسیمی کے انشائیے کے یہ شگفتہ جملے میرے تھکے ہوئے ذہن کو لمحے بھر میں باغ و بہار کر گئے:

''.....اپنی بھابھی، مامی، چاچی کی چغلی کرنے لگتی ہیں۔ ایک بولتی جاتی ہے دوسری اس کے کان کے رستے پیٹ میں بھرتی جاتی ہے اور درمیان میں چھوٹی بڑی آہیں.....اوہ.....آہ کر کے مزہ بھی لیتی جاتی ہے۔ جب اُس کا پیٹ فل ہو جاتا ہے تو پھر دوسری کو روک دیتی ہے اور خود شروع ہو جاتی ہے۔ دونوں بھرے پیٹ ایک دوسرے کو بائے کہتی ہیں۔''

(انشائیہ۔ پیٹ کا چکر)

''.....اُس کے بعد جب ہماری آنکھ کھلی تو ہمیں لگا ہم کسی دوسری دنیا میں ہیں چاروں جانب عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بہت ہی پیاری مہک فضاؤں میں بسی ہوئی تھی دودھ سے زیادہ سفید دو حسین و جمیل لڑکیاں ہمارے سرہانے کھڑی ہوئی تھیں۔ ہم نے سوچا شاید ہم سڑک سے سیدھے جنت کو سدھارے ہیں مگر جب اپنے گناہوں کی گٹھری یاد آئی تو پورے ہوش میں آ گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے بڑے صاحب بہت ہی شفقت بھری مسکان اپنے چہرے پہ سجائے ہمارے ہاتھوں کو سہلا رہے ہیں۔

(انشائیہ۔ آبیل مجھے مار)

ہمیں بیکار سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں ہر منتری کی پچھلی فائلوں کی سی بی آئی جانچ ہو۔ کس منتری نے کس کمپنی کے ساتھ مل کر دیس کے مال کو اپنے باپ کا مال سمجھ کر اڑایا ہے اس کے لئے سرکار وائٹ پیپر جاری کرے۔ ارے بھئی، جو گزر گیا سو گزر گیا، بھول جاؤ۔ اسکے بارے میں تحقیقات کر کے اپنے دیس کو دنیا کے سامنے بدنام کرنے سے کیا فائدہ؟ اگر ایسا ہوا تو ہم میں سے نوے فیصد ممبران، ایوان میں نہیں تہار جیل میں نظر آئیں گے۔ تو پھر یہ دیس چلے گا کیسے؟ کون چلائے گا اسے؟ یہ کل کے لونڈے، جن کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے..... بہت بڑا بڑا خواب دیکھ رہے ہیں۔ کل رات اپنے سیکریٹری کو اسپیکر صاحب کے گھر مزاج پرسی کے لئے نہیں بھیجتا تو وہ بڈھا آج بھی مجھے ٹرخا دیتا۔ موت کی دھمکی اچھے اچھے سنت مہاتما سے وہ کام کروا لیتی ہے جسے کرنا وہ خواب میں بھی سوچ نہیں سکتے، یہ اسپیکر تو آدمی کا بچہ ہے۔ مجھے اس آزاد امیدوار کے بارے میں کچھ کرنا پڑیگا، کل صبح مدن مداری کو فون کرتا ہوں، کب کا انڈر گراونڈ ہے اس کے جوڑ کو بھی زنگ لگ چکا ہوگا۔ ارے..... گیارہ بجنے والے ہیں..... یہ سالا سیکریٹری کا بچہ کہاں مر گیا؟ ابھی تک میرا مال نہیں آیا اور نہ مس چمپی آئی۔ کیا مجھے کل کی طرح آج بھی وہی باسی کھانا کھانا ہوگا؟

ایک طوائف کی ڈائری:

۱۸ فروری ۲۰۰۲ء (صبح ۳:۳۰): آج کی رات بھی کمائی نہیں ہوئی۔ جب سے سامنے والے چوراہے پر بیوٹی پارلر کھلا ہے لوگ ہماری گلی کی طرف کم آنے لگے ہیں۔ کل روپا کہہ رہی تھی کہ اس کا ایک گراہک بتا رہا تھا کہ..... وہاں فُل مالش کا پانچ سو اور ہاف مالش کا تین سو لیتے ہیں۔ وہ بھی وہاں ہاف مالش کروا چکا ہے مگر اسے مزہ نہیں آیا کیونکہ صرف تاش کی گڈی کو پھینٹتے رہو اور پتہ نہ پھینکو تو کھیل کا مزہ کیا رہا۔ یہاں تو سالے سو روپئے میں ہاف اور فُل دونوں طرح کے مالش کروا کے بھی شکایت کرتے رہتے ہیں۔ پرسوں سمرن کے اسکول کی فیس بھرنی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ پوجا ہے لوگوں کی بھیڑ ہوگی تو گراہک زیادہ ہونگے، اوور ٹائم کر کے بھی کچھ کما لونگی مگر کل سے آج تک صرف کمال لنگڑا کے سوا کسی کو دیکھا نہیں۔ وہ حرام کا جنا، بیوی سے لڑ جھگڑ کر یہاں آجاتا ہے

اور آدھا پیسے دیتا ہے اور آدھا بعد میں دیدونگا کہہ کر..... دل مسل کر چلا جاتا ہے۔ بیس سال کے دھندے میں ایسی تنگی پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ پوجا کے ٹائم تو میں اوور ٹائم کر کر کے اتنا تھک جاتی تھی کہ کئی گراہکوں کو ٹھینگا دکھا دیتی تھی، وہ ہاتھ جوڑتے، پاؤں تک پکڑ لیتے تھے مگر اب کی بار کیا ہو گیا ہے بھگوان جانے؟

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب سے شہر والی نرملا دیدی ہماری باڑی میں آکر ہمیں ایڈز (AIDS) کے بارے میں سمجھانے لگی ہیں تب سے کئی جانے پہچانے چہرے غائب ہو گئے ہیں، ادھر کا رُخ نہیں کرتے۔ دیدی نے مجھے سمجھایا تھا کہ..... ''فرض کرو کہ تم کو ایڈز جیسا ڈینجر بیماری ہو جائے تو تمہاری پیاری سی گڑیا سمرن کا کیا ہوگا؟'' میرا خون بھی چیک کیا تھا۔ کالی ماں کی دَیا سے کچھ نہیں نکلا، لیکن دیدی نے کہا کہ اگر کچھ نکلتا تو..... میری گڑیا کا بھی خون چیک کرنا پڑتا۔ ہائے رام! میں بھوکی مر جاؤں گی مگر بنا بیلون لگائے کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں دونگی۔ جب سے میں نے اپنے گراہکوں کے سامنے بیلون لگانے کی شرط رکھی ہے تب سے کئی حرامی ادھر آنے سے کترانے لگے ہیں۔ کوئی بات نہیں، مجھے اپنی نہیں اپنی بیٹی کی پرواہ ہے۔ بس کالی ماں کے کرم سے وہ کچھ لکھ پڑھ لے، تھوڑی سی بڑی ہو جائے تو میں اسے دیدی کے ساتھ شہر کے کسی ہاسٹل میں بھیج دونگی۔ وہ اب آٹھ سال کی ہو گئی ہے، کئی طرح کے سوال کرنے لگی ہے، کل کو کچھ الٹا سیدھا پوچھ لیگی تو؟

اب تو ایک ہی سہارا ہے۔ کل صبح ہوتے ہی شہر والی دیدی کو فون کرونگی اور اُن سے کہہ کر سمرن کے اسکول کی فیس بھروا دونگی۔ نہیں تو میری گڑیا کو اسکول سے نکال دیں گے۔ میرا سپنا ادھورا رہ جائیگا۔ لوگ رات کو سوتے ہیں تو سپنے دیکھتے ہیں مگر ہم تو رات کی رانی ہیں، دن میں سوتے ہیں اور سُنا ہے کہ دن کے سپنے جھوٹے ہوتے ہیں۔ اے کالی ماں! میری گڑیا رانی کو اس نرک سے دور رکھنا، بس یہ بنتی ہے تجھ سے!!

ایک کنواری عورت کی ڈائری:

۱۱ جولائی ۲۰۰۲ء (رات ۱:۴۵): آج پھر مجھے پیریڈ کروایا گیا۔ کیا فائدہ؟ مجھے پتا ہے کہ دو چار دن بعد جواب ملے گا کہ لڑکی کی عمر زیادہ ہے، چہرے کی رونق اُڑ گئی ہے، ہمیں بیس سے پچیس کے اندر کی کمسن کلی چاہیئے، آپ کی بیٹی تو پینتیس پار کر چکی ہے۔ اس سے پہلے بھی یہی ہوا ہے اور آگے بھی یہی ہوتا رہیگا۔ میں نے تو ماں سے صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے شادی نہیں کرنی ہے۔ میں ٹیچر ہوں، سلائی کڑھائی جانتی ہوں، اپنا خرچ کسی طرح اٹھا لونگی۔ مگر ماں کو نہ جانے کیوں مجھے گھر سے بھگانے کی جلدی ہے۔ خیر اب تو بہت دیر ہو چکی ہے۔ جب میں نوخیز کلی تھی، انگ انگ جوانی سے مہکتا تھا، ہونٹوں سے پریم رَس ٹپکتا تھا تب ہر رشتے میں ماں کو کوئی نہ کوئی خامی نظر آتی تھی۔ کسی لڑکے کی عمر زیادہ تو کسی لڑکے کا پریوار بہت بڑا نظر آتا تھا۔ ایک بار تو ایک لڑکا مجھے بہت پسند آ گیا تھا۔ شریف تھا، خوبصورت تھا، کیا ہوا جو پرائیوٹ کالج میں لکچرار تھا۔ جب وہ مجھے دیکھنے آیا تھا تو کتنی میٹھی نظروں سے گھور رہا تھا، پہلی بار میرے دل میں عجیب سی گدگدی ہوئی تھی۔ اُس نے سب کی نظر بچا کر اپنا فون نمبر بھی دیا تھا۔ میں اس کے ساتھ دو تین بار پارک میں اور ایک بار فلم دیکھنے بھی گئی تھی۔ ہال کے اندھیرے میں اس نے میرے ساتھ کچھ زیادہ بدتمیزی بھی نہیں کی تھی۔ مجھے بھی وہ بہت پسند آ گیا تھا مگر ماں کی ضد کے آگے پتا جی کو بھی جھکنا پڑا اور وہ رشتہ ٹوٹ گیا۔ اُس رات میں اُس کی باتوں کو یاد کر کے کتنا روئی تھی۔ اُس نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ چلو گھر سے بھاگ جاتے ہیں۔ ایک بار شادی ہو گئی تو سب ٹھیک ہو جائیگا مگر میں چھوٹی بہنوں کا سوچ کر نہیں بھاگی۔ حالانکہ میری تینوں چھوٹی بہنوں نے میری شادی کا بھی انتظار نہیں کیا۔ اپنے اپنے یار کے ساتھ بھاگ گئیں اور ماں..... روپیٹ کر چُپ ہو گئی۔

مگر آج کل تو ماں نے دوسری تیسری شادی کے خواہش مند رنڈوؤں کو، طلاق شدہ مردوں کو بھی بٹھانا شروع کر دیا تھا۔ کیا میری پسند، میری مرضی کی کوئی وقعت نہیں؟ کیا میں کوئی بھیڑ، بکری ہوں کہ جیسا بھی قصائی ہو اگر دام صحیح دے رہا ہے تو بیچ دو۔ میں ایسا ہونے نہیں دونگی۔ مجھے اب شادی کی ضرورت بھی نہیں۔ رام میرا پورا خیال رکھ رہے ہیں، کیا ہوا جو شادی شدہ ہیں۔

بیوی کا سارا سکھ تو دے رہے ہیں نا؟ میری ہر ضرورت کا خیال رکھ رہے ہیں، دن بھر میرے ساتھ اسکول میں پتی کی طرح پیش آتے ہیں اور کہتے ہیں..... ''روپا! تم میری دن کی پتنی ہو اور گھر میں جو ہے وہ رات کی پتنی۔ وہ میرے بچوں کی ماں ہے..... تم نہیں ہو سکتیں۔ بس یہی فرق ہے ورنہ میں تم کو اُس سے ہزار گنا زیادہ پیار کرتا ہوں۔ مجھے اور کیا چاہیئے؟؟''۔ ویسے بھی سُپریم کورٹ نے آرڈر پاس کر دیا ہے کہ ''دو بالغ مرد و عورت اپنی مرضی سے ایک ساتھ ایک چھت کے نیچے رہ سکتے ہیں، ۔ گھر والے یا سماج ان کو ایسا کرنے سے روک نہیں سکتا، یہ قانوناً جرم ہوگا''۔ اب دیکھتی ہوں کون کرواتا ہے میری شادی؟۔ مجھے نہیں کرنی ہے شادی وادی!!

ایک چور شاعر کی ڈائری:

۲۵ نومبر ۲۰۰۵ (رات ۱۰:۱۲): آج پرانے قلعے میں ہونے والے عالمی مشاعرہ کی دعوت ملی ہے۔ کتنی کوشش اور دھر پکڑ کے بعد یہ موقع ملا ہے۔ سرکاری مشاعرے میں شامل ہونے کے لئے رولنگ پارٹی کے ممبران کی کتنی خوشامد کرنی پڑتی ہے یہ میرا دل جانتا ہے۔ لیکن ایک پرابلم ہے۔ ملک کے کونے کونے سے نئے پرانے شعرا اور خوبصورت اداؤں والی شاعرات (گلوکارہ) آرہی ہیں۔ ایسے میں اگر میں پکڑا گیا تو بڑی بے عزتی ہو جائیگی اور رام منوہر بابو تو مجھے دھکے دیکر نکال دینگے۔ پچھلے مہینے کمال پور کے مشاعرے میں جو ہوا، خدا وہ دن کبھی نہ دکھلائے۔ اگر پانچ سو کا نوٹ اس نوجوان کی جیب میں نہیں ڈالتا تو وہ جو شاعر کم پہلوان زیادہ لگ رہا تھا مجھے پٹک پٹک کر مارتا۔ اب مجھے کیا پتا تھا کہ میں چوری کی جو غزل پڑھ رہا تھا اُس کا اصل مالک وہ پہلوان شاعر تھا۔ اور وہ اُس کی شائع شدہ مشہور غزل تھی جس کو وہ خود بھی پڑھنے کے لئے تیار ہو کر آیا تھا۔ جب اُس نے دھیرے سے مگر دھمکی بھرے ٹون میں میرے کان کے پاس آکر کہا کہ..... ''عیّار سبزواری صاحب میری غزل کب سے آپ کی غزل ہوگئی؟ اور آپ کب سے دوسروں کی غزل کو اپنی کہہ کر پڑھتے آرہے ہیں؟ ابھی میرا نمبر آنے دیجئے، میں آپ کی چوری کا پول سب کے سامنے کھولونگا اور ثبوت کے طور پر ماہنامہ ''ترچھی اوڑھنی'' کا یہ شمارہ سب کو دکھاؤنگا۔ اور جب مشاعرہ ختم ہو جائیگا تو آپ مجھ سے ملے بغیر نہیں جائیں گے، سمجھے؟!''

اسکی باتیں اور ہاتھ میں پکڑے ثبوت کو دیکھ کر میرا پاجامہ ڈھیلا ہونے لگا تھا۔ میں نے چپکے سے ایک پانچ سو کا نوٹ اس کی جیب میں گھسا کر کہا..... ''پہلوان صاحب، بس ایک دن پہلے ہی دعوت نامہ ملا تھا اس لئے چھان پھٹک کرنے کا وقت نہیں ملا۔ آپ کی غزل نے دل کے تار کو ہلا کر رکھ دیا تھا..... سوچا پڑھ کر لوگوں کے دلوں میں ہلچل مچا دیتا ہوں مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ بھی وہی غزل پڑھنے والے ہیں۔ ہم دونوں ہی شاعر ہیں۔ میرا نہ سہی شاعروں کی برادری کا کچھ خیال کریں اور مجھے اپنا بڑا نہ سہی چھوٹا بھائی ہی سمجھ کر معاف کردیں۔ اب یہ میری منت سماجت کا اثر تھا یا پانچ سو کے نوٹ کا کہ اس نے معاف کردیا کہ آئندہ ایسا نہ کرنا..... اگر کہیں سے بھی سنا یا پڑھا کہ آپ نے میری کیا کسی کی بھی غزل کی چوری کی ہے تو یاد رکھیں..... آپ کے گھر آکے ماروں گا اور واپسی کا کرایہ بھی آپ سے ہی لے کر آؤں گا۔

عالمی مشاعرے میں وہ پہلوان شاعر ضرور آئیگا۔ اگر میری چوری پکڑ لی تو؟ ایسا کرتا ہوں، حلال بک ڈپو چلا جاتا ہوں، وہاں پرانی اور چوری کی کتابیں آدھے دام میں ملتی ہیں۔ وہاں سے کوئی بہت پرانا رسالہ یا فلمی میگزین ڈھونڈتا ہوں۔ اس میں سے کسی گمنام شاعر کی غزل لے کر..... تھوڑی اُلٹ پھیر کردونگا تو وہ میری ہوجائیگی اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ مگر ایک اور بڑی پرابلم ہے یار..... اِس مشاعرے میں بھاگلپور سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی صاحب بھی آرہے ہیں جو ادب کی دنیا میں جن کے نام سے مشہور ہیں۔ جن کی یادداشت کے آگے مائیکروسوفٹ کا سُپر کمپیوٹر بھی فیل ہوجائے، اگر انہوں نے دھر دبوچا تو؟ پانچ سو کیا پانچ لاکھ بھی کسی کام نہیں آئے گا۔ اور میرے بارے میں ایک مضمون کئی رسالوں میں ضرور آجائے گا کہ..... عیّار سبزواری چور شاعر ہے! اور میں کسی مشاعرہ میں کیا کسی نشست میں بھی جانے سے رہا۔ یا اللہ، تجھے اپنے پیارے بندوں کا واسطہ کوئی ایسا ضروری کام نکل آئے کہ مناظر صاحب پرانے قلعے کے مشاعرے میں نہ آئیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ گیارہ بھکاریوں کو کھانا کھلاؤں گا.....!!

☆☆☆

غصے کے سائیڈ افیکٹس!

صبح کا سہانا موسم تھا۔ سب اپنے اپنے کام کو جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ پھر ناشتے کے ٹیبل پر سب آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ صبح کا ناشتہ بھی کیا اور ایک دوسرے سے باتیں بھی کیں۔ ہر دن یہی ایک وقت ہوتا ہے جب پریوار کے سب لوگ ایک ساتھ ہوتے ہیں اُسکے بعد ہر کوئی اپنے اپنے مرکز کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ واپسی سب کی الگ الگ وقت پہ ہوتی ہے۔ اس لئے ملاقات کا یہی وقت سب کو ملتا ہے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر سب چائے پینے لگے کہ اچانک نیہا کا ہاتھ چائے کی کپ سے ٹکرایا اور کپ ٹیبل سے نیچے گر گئی۔ چائے چھٹک کر پروفیسر شرما کی آستین کو بھگو گئی۔ کچھ ٹیبل کے اوپر بھی گری۔ پروفیسر شرما یونیورسٹی کے لئے پہلے ہی دیر ہو چکے تھے اس ناگہانی پریشانی سے اور بپھر گئے اور بیٹی نیہا پہ برس پڑے ''اتنی بڑی ہو گئی ہو پھر بھی عقل نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ایسے اٹھاتے ہیں چائے کی کپ؟ پورے کپڑے کو خراب کر ڈالا، اگر یہ گرم چائے میرے منہ پہ گرتا تو؟؟؟''۔ پھر انہوں نے اپنی پتنی کو آڑے ہاتھوں لیا..... ''اور تم برسوں سے چائے لا کر رکھتی ہو، تمہیں اتنی بھی سمجھ نہیں کہ چائے کہاں رکھنی ہے؟ بچی کے ہاتھ کے پاس لا کر چائے رکھ دی وہ بھی ٹیبل کے کنارے۔ کیا اتنے بڑے ٹیبل میں کہیں اور جگہ نہیں تھی چائے رکھنے کے لئے؟ نونسینس..... اب کھڑی کھڑی میرا منھ کیا دیکھ رہی ہو، جلدی سے میرا دوسرا شرٹ لاؤ، مجھے دیر ہو رہی ہے۔ اور تم نیہا..... کیا نہیں آج اسکول نہیں جانا ہے؟ منھ پھلائے بیٹھی ہو، جلدی اٹھو اور چلو، تمہیں اسکول ڈراپ کر کے مجھے یونیورسٹی بھی پہنچنا ہے''۔

اتنا کہہ کر پروفیسر شرما اُٹھے اور اپنی پتنی کے ہاتھ سے دوسرا شرٹ لے کر پہننے کے لئے روم میں چلے گئے۔ پتنی بیچاری احساس جرم اور سب کے سامنے پڑی ڈانٹ سے شرمندہ سر جھکائے ٹیبل صاف کرنے لگی۔ بیٹی نیہا آنکھ جل تھل کئے..... دوڑی اپنا سکول بیگ لینے۔ پھر

جلدی جلدی دونوں باپ بیٹی کار میں بیٹھے۔ راستے میں ٹرافک جام کی وجہ سے پروفیسر شرما کا دماغ کچھ اور بھنا گیا۔ دو ایک رکشا والوں کو بُرا بھلا بھی کہا جو انکی کار کے آگے کھڑے ہو گئے تھے۔ جیسے تیسے کر کے نیہا کو سکول چھوڑا اور یونیورسٹی پہنچتے پہنچتے ایک گھنٹہ لیٹ ہو گئے۔ ایک کلاس مس ہوا۔ ریسرچ کے اسٹوڈینٹس نے پرنسپل سے شکایت کر دی کہ امتحان قریب ہے اور پروفیسر شرما کلاس نہیں لے رہے ہیں۔ پروفیسر شرما جیسے ہی چیمبر میں پہنچے پرنسپل صاحب کا بلاوا آ گیا۔ سہمے سہمے گئے اور آدھا گھنٹے بعد جب پروفیسر شرما پرنسپل صاحب کے کمرے سے نکلے تو صرف چہرہ ہی نہیں سر سے لے کر پیر تک لال تھے۔ اتنی بے عزتی ان کی کبھی نہیں ہوئی تھی، وہ یونیورسٹی کے سب سے قابل اُستاد تھے مگر..... آج پرنسپل صاحب نے ان کی قابلیت کی کوئی قدر نہیں کی اور جو جی میں آیا سُنا دیا۔ ان کا دیر سے آنا، کلاس نہ لینا، اسٹوڈینٹس کی شکایت وغیرہ وغیرہ..... ان کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے اور دن بھر پروفیسر شرما اندر ہی اندر سسک رہے تھے۔

پروفیسر شرما سوچ رہے تھے کہ..... یہ سب کیوں ہوا؟؟؟ آج صبح اگر وہ چائے کی پیالی نیچے نہیں گرتی تو..... یہ سب نہیں ہوتا۔ نہ چائے کی پیالی گرتی اور نہ ان کا شرٹ خراب ہوتا۔ نہ وہ ٹرافک میں پھنستے اور نہ یونیورسٹی ایک گھنٹہ لیٹ سے آتے..... اور نہ اسٹوڈینٹس پرنسپل کے پاس جاتے اور نہ..... پرنسپل صاحب انہیں اتنی کھری کھوٹی باتیں سناتے! یہ سب اُس چائے کی پیالی کے گرنے سے ہوا اور اس کے گرنے کا کارن بنی ان کی پتنی۔ نہ وہ چائے کی پیالی کو ٹیبل کے یکدم کنارے رکھتی نہ نیہا ہاتھ لگا کر اسے گراتی۔ پروفیسر شرما کے دل نے فیصلہ سنا دیا کہ..... آج جو کچھ بھی انکے ساتھ ہوا اس کی ذمہ دار ہے..... صرف اور صرف ان کی پتنی.....!!

ہم دن بھر گھر سے باہر مزدوری کرتے ہیں، اُستادی کرتے ہیں، افسری کرتے ہیں یا کچھ اور کرتے ہیں اور پیسہ کماتے ہیں۔ اس لئے ہمارا کام..... کام ہے اور وہ دن بھر گھر سنبھالتی ہیں، کھانا بناتی ہیں، کپڑے دھوتی ہیں، پریس کرتی ہیں، جوتے اور گھر چمکاتی ہیں، ہمارے بوڑھے ماں باپ کا خیال رکھتی ہیں، ہمارے بچوں کو سنبھالتی ہیں اور..... جب ہم کام سے لوٹتے ہیں تو ہمارا

ہر طرح سے خیال رکھتی ہیں۔ پھر بھی ہم سوچتے ہیں کہ وہ قصوروار ہے! کیا صرف اس لئے کہ اُس کے دن بھر کے کام کی کوئی تنخواہ نہیں ہے؟ وہ ہماری طرح پیسہ نہیں کماتی ہے؟؟

پروفیسر شرما اگر خود کا محاسبہ کریں تو..... دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ اگر چائے کی پیالی نیہا کا ہاتھ لگنے سے گر گئی تھی اور ان کا شرٹ خراب ہو گیا تھا تو کونسا آسمان ٹوٹ پڑا تھا؟ کیا ان کے ہاتھ سے کبھی چائے کی پیالی نہیں گری؟ وہ غصّے سے بھڑکنے کے بجائے اگر اپنی اکلوتی اولاد کو پیار سے سمجھاتے..... بیٹا، دیکھ کر لیا کرو، اگر گرم گرم چائے تمہارے ہاتھ یا پاؤں پہ گر جاتی تو؟ اور اپنی پتنی کو بھی نرمی سے کہتے کہ..... بھئی! آج آپ چائے کی پیالی غلط جگہ کیوں رکھ دیں، جہاں روز رکھتی ہیں وہاں رکھتیں تو نہیں گرتی اور میرا شرٹ خراب نہیں ہوتا، اب آپ کو ہی دھونا پڑیگا۔ چلو جلدی سے میرا دوسرا شرٹ لاؤ مجھے دیر ہو رہی ہے۔

اگر پروفیسر شرما ایسا کرتے تو..... اس کا اثر بہت دیرپا ہوتا۔ بیٹی سوچتی کہ میرے پاپا مجھے سے کتنا پیار کرتے ہیں، میرے جلنے سے ان کو کتنی تکلیف ہوتی۔ اور پتنی کو سب کے سامنے شرمندگی بھی نہیں ہوتی اور وہ اپنی غلطی کا احساس بھی کرتیں۔ اور سب سے بڑی بات کہ..... پروفیسر شرما ایک صاف ذہن کے ساتھ گھر سے یونیورسٹی کے لئے نکلتے، راستے میں رکشا والوں سے تو تو میں میں بھی نہیں ہوتی اور غصّے میں پرنسپل صاحب کو الٹا سیدھا جواب دیکر ان سے بے عزت ہونے سے بھی بچ جاتے اور دن بھر شرمندگی کی آگ میں اندر ہی اندر نہیں جلتے۔ ہے نا؟!

کہتے ہیں کہ غصہ کرنا حرام ہے۔ اور حرام چیزوں میں یہی ایک ایسی چیز ہے جس کو پی جانے کا حکم ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ نے فرمایا ہے کہ "اپنے غصّے کو پی جانے والا انسان ہی دنیا کا سب سے طاقت ور انسان ہے"۔ ہم ذرا ذرا سی بات پر غصہ کرتے ہیں اور اپنا ہی نقصان کر جاتے ہیں کہ غصے میں اچھے برے کی تمیز نہیں رہتی۔ ہمارے غصے کو سب سے زیادہ جھیلنے والی ہماری پتنی/ بیوی/ وائف کو بھی تو غصہ آتا ہوگا؟ کیا ہم نے کبھی سوچا ہے کہ وہ اپنا غصہ کس پہ نکالے؟؟؟

☆☆☆

افسانچے

گوشت

صبح سے رم جھم بارش نے موسم کو سہانا کر دیا تھا۔ کملو چمار کو نہ جانے کیوں بکرے کا گوشت بہت یاد آنے لگا۔ اس کی زبان بار بار ذائقے دار گوشت کا لمس محسوس کرنے لگی اور ناک بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو سے بے چین ہو اٹھا۔ کملو چمار کے پاس صرف بیس روپئے تھے مگر شام ہونے تک گوشت کھانے کی للک اتنی بڑھ گئی کہ اس کے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے قدم سیدھے جمعہ خان کی گوشت کی دکان تک پہنچ گئے۔ بیس روپئے دیکر اس نے بکرے کا گوشت مانگا تو مغرور جمعہ خان نے وہ روپئے اس کی طرف پھینک دیئے اور کہا..... ''بھاگ یہاں سے بیس روپئے میں بکرے کا گوشت کھائیگا۔ تیرے باپ نے کبھی کھایا ہے بکرے کا گوشت؟ ڈیڑھ سو روپیہ کلو بکتا ہے اور آج تو آرڈر اتنا ہے کہ گوشت تو دور .....بیس روپئے میں تیرے کو چھونی بھی نہیں ملے گا۔''

بے چارہ کملو دل مسوس کر گوشت کی بھوک دل میں دبائے.....سیدھے دیسی دارو کے اڈے پر پہنچا اور دس روپئے میں ایک بوتل دارو پینے کے بعد.....اس کے قدم شہر کے سب سے بڑے اور بدنام.....گوشت منڈی کی طرف بڑھ گئے۔ کملو چمار جانتا تھا کہ قصائی نے تو بیس روپئے میں گوشت دینے سے انکار کر دیا تھا مگر..... یہاں اُس کو دس روپئے میں بھی زندہ گوشت مل جائے گا۔

☆☆☆

مہنگائی

وہ ہاتھ جوڑے ٹیوشن ماسٹر کے آگے گڑگڑا رہا تھا..... ''ماسٹر جی! میں غریب آدمی ہوں۔ مجھ پہ رحم کیجئے۔ مدن کی ماں بیمار ہوگئی تھی، میری ساری تنخواہ اس کی دوائی میں خرچ ہوگئی۔ میں اس ماہ آپ کی فیس نہیں دے پاؤنگا، اگلے ماہ کہیں سے بھی لادونگا۔ میرے بچے کو پڑھنے دیجئے..... اسے ٹیوشن سے مت نکالیئے''۔ مگر پروفیسر شرما نہیں مانے اور انہوں نے مدن کا ہاتھ پکڑ کر روم سے باہر نکال دیا اور کہا..... ''جاؤ اپنے باپ کے ساتھ اور جب پانچ سو روپئے کا جگاڑ ہوجائے تو ٹیوشن آجانا''۔

غصے سے کواڑ بند کر کے پروفیسر صاحب جیسے ہی پلٹے..... اپنی دھرم پتنی سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔ وہ تنک کر بولی..... ''کہاں چلے جاتے ہو، کب سے ڈھونڈ رہی ہوں، جلدی سے ایک ہزار کا نوٹ دینا تو..... آج ماریا کو ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔ کل رات بھر درد سے بلبلاتی رہی ہے بیچاری''۔ پروفیسر صاحب نے جلدی سے پرس نکال کر ہزار کا نوٹ پکڑا دیا اور بولے..... ''جانو! مہنگائی کا زمانہ ہے، اپنی کٹیا کو کسی لوکل ڈاکٹر سے ٹریٹمینٹ کرواؤنا..... پلیز''۔

☆☆☆

"...... بالکل اسی طرح ہمارے بازاری بابا بھی بڑے گوشت خور ہوتے ہیں۔ ہمیشہ ماتا جی کی تاک میں رہتے ہیں۔ یہ راون کی اولاد ہوتے ہیں اور کل یگ کی سیتاؤں کو بہلا پھسلا کر لوٹ لیتے ہیں۔ اور دکھ تو اس بات کا ہے کہ ہماری موڈرن سیتائیں بھی سب جان بوجھ کر...... کبھی امتحان میں اچھے نمبروں کے لئے، کبھی اپنے پریمی کو پانے کے لئے، کبھی پتی کو اپنے بس میں کرنے کے لئے تو کبھی اپنی ساس کے جلدی مرجانے کے لئے اِن لفنگے باباؤں کی شرن میں آتی ہیں اور بابا ان کا سب کچھ ہرَن کر لیتے ہیں۔"

(انشائیہ۔ بابا رے بابا)

منیر ارمان نسیمی کے انشائیے کے انفرادی اسلوب سے میری واقفیت انٹرنیٹ کی مختلف ویب سائٹز شعروسخن، اردو بندھن، اپنا جلال پور، اردو انجمن، اردوستان، اردو گلبن، جدید ادب اور سخنور وغیرہ کے ذریعے سے ہوئی جب کہ اُن کی تخلیقات ہندوستان و پاکستان کے کئی اعلیٰ ادبی جریدوں کی زینت بن رہی ہیں۔ اُن کے اسلوب کی انفرادیت دراصل وہ بے ساختہ شگفتگی اور بے تکلفی ہے جو قاری کو تحریر میں بہت آسانی سے اس طرح مشغول کر لیتی ہے کہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے بے گانہ ہو کر زیرلب مسکرانے لگتا ہے۔

منیر ارمان نسیمی کی تحریر سے اُن کی شخصیت کے بارے میں ایک انجانہ سا تصور خود بخود نظروں کے سامنے اُبھرنے لگتا ہے جیسے ایک مہذب و شائستہ سی طبعیت رکھنے والا نوجوان جس کے مزاج میں نرمی اور دھیماپن ہو مگر آنکھیں ذہانت اور شرارت سے بھری ہوئی ہوں۔ کہتے ہیں طنزومزاح لکھنے کے لیے بنیادی ضرورت اِس بات کی ہوتی ہے کہ تحریر میں کہیں کوئی پھکڑپن نہ ہو اور نہ ہی کوئی ایسا انداز جس سے کسی کی دل آزاری ہو اور منیر ارمان نسیمی کے انشائیے اور خاکہ نگاری کے بے تکلفانہ اسلوب میں ایسا ہی لطیف تکلف ملتا ہے جو اُنہیں اِس عیب سے صاف بچالیتا ہے۔ ایک انشائیہ 'مکھی چوس' میں اُن کی قوت مشاہدہ دیکھیے:

محبت

ابا جی جب بھی میرے گھر آئینگے..... گیٹ سے ہی چلانا شروع کر دینگے بابو..... بابو.....!! کتنی بار منع کیا کہ یہ ہمارا گاؤں نہیں ہے۔ آفیسرز کالونی ہے۔ میرے پڑوسی کیا سوچیں گے؟

آج بھی وہی ہوا۔ میں یوگا کر رہا تھا مگر بیچ میں ہی چھوڑ کے دوڑا کہ جب تک ان کے سامنے نہیں آجاؤنگا وہ چلانا بند نہیں کریں گے۔ مجھے دیکھتے ہی خوش ہو گئے اور بولے..... ''تیری تنخواہ مل گئی ہے؟ مجھے پانچ سو روپے کی سخت ضرورت ہے، تمہاری ماں کا چشمہ اور میرے لئے.....''

میں چڑھ گیا اور بولا..... ''آپ کو پانچ سو روپے چاہئے بول دیتے، میں کیسے بھی اور کہیں سے بھی لا کر دیتا۔ تنخواہ ملی یا نہیں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ جب میں پڑھتا تھا تو آپ سے پیسے مانگتا تھا، کبھی میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ کے پاس ہیں یا نہیں؟؟؟''

ابا جی کے ہونٹوں پر ایک شفقت بھری مُسکان مچل رہی تھی!!

☆☆☆

پیٹا PETA

میں آفس جانے سے پہلے سیدھے میڈیسن اسٹور پہنچا اور کیمسٹ سے کہا.....
''بھائی صاحب، جلدی سے مجھے دوائی دیدو۔ میرے کتے کو صبح سے اسہال آرہے ہیں۔ بیچارہ بڑی مشکل میں ہے''۔ کیمسٹ نے کہا''ڈاکٹر کا پریسکرپشن دکھایئے''۔ میں نے کہا.....''ارے بھائی میں سیدھے آپ کے پاس آیا ہوں، آپ ہی کچھ دوا دیدو آپ کسی ڈاکٹر سے کم ہو کیا؟''۔تو وہ بولا.....''تو پھر جایئے اور اپنے کتے کو ساتھ لے کر آیئے۔ ہم مریض کو دیکھے بنا دوا نہیں دیتے''۔ میں تلملا گیا۔ پہلے ہی مجھے آفس کو دیر ہو رہی تھی اوپر سے یہ ناٹک دیکھا رہا تھا۔ میں نے کہا.....''ارے بھائی.....کل شام کو ہی میں آپ سے کہہ کر.....اپنی ماں کے لئے دوا لے کر گیا ہوں، کل تو آپ نے نہیں کہا کہ ڈاکٹر کا پریسکرپشن دکھایئے یا.....اپنی ماں کو لے کر آیئے؟''۔

وہ کیمسٹ مجھے حیرت سے دیکھنے لگا اور بولا.....''کیا آپ اخبار نہیں پڑھتے ہیں؟ آپ کی ماں کی بات اور ہے کتے کی بات اور۔ اگر کتے کو بنا دیکھے میں نے دوا دیدی اور اسے کچھ ہو گیا تو.....PETA والے میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائینگے اور بات پارلیامنٹ تک.....!!''۔

☆☆☆

پوسٹ کارڈ

آجکل کے بچے.....سیم کارڈ، کریڈٹ کارڈ، اے ٹی ایم کارڈ اور پان کارڈ میں جی رہے ہیں۔ موبائل اور ای میل کے زمانے میں خط لکھنے والوں کو ایسی حیرت

سے دیکھتے ہیں جیسے..... کسی اور دنیا کی مخلوق ہوں۔ ابھی کل کی ہی بات ہے۔ میں شام آفس سے گھر لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ڈرائنگ روم میں میری بیوی اور بچے ایک ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک پوسٹ کارڈ کو ٹینس بال کی طرح ادھر ادھر کر رہے ہیں۔ میں ڈر گیا، اللہ نہ کرے کوئی بری خبر ہوگی۔ جلدی سے آگے بڑھا اور وہ کارڈ اپنے بیٹے کے ہاتھ سے چھین لیا۔ جلدی جلدی پڑھا تو دل کو سکون ملا اور فرط خوشی سے چہرے کی نورانی کیفیت نے میری بیوی کو شک و شبہہ میں ڈال دیا کہ ہو نہ ہو کسی محبوبہ کا خط ہے (میرے بچے، انگریزی تعلیم کے پروردہ..... اردو لکھنے پڑھنے سے عاری ہیں)۔ میں نے پوسٹ کارڈ پڑھنے کے بعد انھیں بتایا کہ..... میری ایک کہانی پڑھنے کے بعد ایک فین نے مجھے یہ تعریفی پوسٹ کارڈ لکھا ہے۔

سب کے منہ حیرت زدہ رہ گئے۔ پھر ایک لمبی اور گہری آہ بھر کے سب کے سب اُٹھ کھڑے ہوئے جیسے میں نے ٹیلی ویژن پہ ایم ٹی وی کے بدلے دوردرشن لگا دیئے ہوں۔ وہ بیچارے کیا جانیں کہ..... محمد انیس اظہر صاحب کا یہ پوسٹ کارڈ میرے دن بھر کی تھکان اتار گیا ہے۔ انیس صاحب چاہتے تو رسالے میں چھپے میرے فون نمبر پہ مجھے فون کر کے مبارکباد دے سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ مجھے ایک پوسٹ کارڈ لکھ دیا۔ اس پوسٹ کارڈ نے مجھے کتنی خوشی دی ہے یہ بات میرے ماڈرن بچے نہیں سمجھیں گے۔ ایک پوسٹ کارڈ لکھنے کے لئے انیس صاحب کو پوسٹ کارڈ خریدنے کے لئے پوسٹ آفس جانا ہوا ہوگا، پھر اس کو لکھنے میں انہوں نے کتنا وقت صرف کیا ہوگا..... اور پھر دوبارہ پوسٹ کرنے کے لئے ان کو پوسٹ آفس جانا پڑا ہوگا۔ کتنا وقت صرف کیا ہوگا انھوں نے مجھ جیسے ایک اجنبی قلم کار تک اپنے احساسات پہنچانے کے لئے؟؟ کیا میری بیوی بچے اس کارڈ کا مول لگا سکتے ہیں؟؟؟

یہ پوسٹ کارڈ میرے لئے انمول ہے.....!!!

☆☆☆

نیٹ ورک

شام کو آفس سے گھر لوٹتے ہوئے جب لان میں بیوی انتظار میں بیٹھی ہوئی نظر نہیں آئی تو میرا ماتھا ٹھنکا کہ..... خدا خیر کرے! کوئی غیر معمولی بات ہوگئی ہے۔ ورنہ روز دو تین بار آفس فون کرنے والی اور شام کو چائے کا ٹرے لے کر لان میں انتظار کرنے والی میری نئی نویلی بیوی نے آج دن بھر میں ایک بار بھی فون نہیں کیا تھا، اس کے لئے میں پہلے ہی پریشان تھا۔ جلدی سے گھر کے اندر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میم صاحب بیڈ پہ لحاف اوڑھے پڑی ہوئی ہیں، آنکھ کے کونے سے آنسو کی دھار کان کے سوراخ تک پہنچ رہی ہے۔ کام والی بائی رادھا سر دبا رہی ہے۔ میں گھبرا گیا..... کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کہتے ہوئے جیسے ہی اپنی بیوی کے سر پہ ہاتھ رکھنے کی کوشش کی اس نے جھٹک دیا اور تنک کر بولی..... ''رہنے دیجئے اپنا یہ جھوٹا دکھاوے کا پیار۔ کہاں تھے آپ دن بھر؟ کس کلموہی کے ساتھ مستی کر رہے تھے جو ایک بار بھی فون کر کے میری خیریت دریافت نہیں کی؟؟

اپنی بیوی کا یہ روپ دیکھ کر میں ڈر گیا۔ میں نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی کہ آج آفس میں ایک بہت ضروری میٹنگ تھی جس کی وجہ سے مجھے فون کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ تب بیوی اور بھی بھڑک اٹھی بولی..... پھر جھوٹ! آخر ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے اور کتنی جھوٹ بولیں گے آپ؟ اگر آپ میٹنگ میں مصروف تھے تو آپ کے موبائل پہ وہ لڑکی کون تھی؟؟ ضرور آپ کا آفس میں کسی کے ساتھ چکر

ہے۔اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ میں کیا کروں؟ میں نے پوچھا.....میرے موبائل پہ کون سی لڑکی نے تم سے کیا کہا؟ میرا موبائل تو صبح سے میرے پاس ہے پھر تم سے کس لڑکی نے بات کی؟ مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ کیا معاملہ ہے اس کے بعد جی بھر کے رو لینا۔تب میری بیوی نے کہا.....مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ مجھے تیز بخار آ گیا تھا اور سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔تب میں نے رادھا سے کہا کہ ذرا صاحب کو فون لگا اور پوچھ تو سر درد کا ٹکیہ کہاں رکھے ہیں؟ اور رادھا نے جب جب بھی آپ کو فون لگایا اُس کمینی عورت نے منع کر دیا۔میں نے رادھا کی طرف تعجب سے دیکھا تو وہ جھٹ سے بولی.....''ہاں صاحب جی! ہم نے بی بی جی کے کہنے پر آپ کا نمبر کم سے کم دس بار لگایا مگر ہر بار اُدھر سے ایک عورت نے بڑے پریم سے ہم کا جواب دیا کہ.....''آپ ابھی بیمست ہیں اور ابھی بات کرنا سمجھ نہیں ہے''۔

☆☆☆

With Best Compliments from :

NAWAQ

Multimedia

a complete house for multi-language printing

خوبصورت کتابت، آفسٹ کی طباعت.....مسودہ روانہ کریں اور گھر بیٹھے کتاب چھپوائیں

Chota Shakarpur, Bhadrak-756100 [Orissa] India
Mobile:0091-9937123956,armaan28@yahoo.com

اُدھار کی عید

عید اگر ہوتی ہے تو امیروں کی یا پھر.....غریبوں کی! ہم درمیانی درجے کے مڈل کلاس نوکری پیشہ لوگوں کے لئے عید.....خوشیوں کی بہار نہیں بلکہ قرضوں کا اُپہار لے کر آتی ہے۔ایک تو ہماری تنخواہ مہینے کی پندرہ تاریخ تک ختم ہو جاتی ہے، باقی کے پندرہ دن اُدھار میں گزرتے ہیں۔اُس پہ رمضان کا خرچہ۔ ہمارے لئے عید..... عید سعید نہیں.....اُدھار کی عید ہوتی ہے۔

ہم مڈل کلاس لوگ.....امیروں اور غریبوں کے درمیان پستے رہتے ہیں۔ توازن قائم رکھنے میں ہماری حالت بگڑ جاتی ہے۔ نہ امیروں کی طرح ٹھاٹ سے عید منا سکتے ہیں اور نہ غریبوں کی طرح کسی کے آگے ہاتھ پھیلا سکتے ہیں۔ہم اپنی جھوٹی بھرم قائم رکھنے کے لئے.....بس اُدھار ہی کر سکتے ہیں۔ہمارے بچے احساسِ کمتری کا شکار نہ ہوں اس کے لئے ہم احساس قرض میں ڈوب جاتے ہیں۔ہم سے تو اچھے ہیں وہ غریب، فقیر و نادار لوگ جو مانگ کر، زکواۃ میں ملے دو تین جوڑوں میں بے فکر ہو کر عید کی خوشیاں لوٹتے ہیں، نہ کسی قرض کا بوجھ اور نہ کسی کے اُدھار کا غم۔کیا پرانے، صاف سُتھرے کپڑوں میں عید نہیں ہوتی ہے؟؟!

☆☆☆

قسمت والوں کی عید

محمد عثمان غنی رکشا تو چلا رہا تھا مگر اُس کا دھیان کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ رمضان کے بیس روزے ہو چکے تھے مگر ابھی تک کہیں سے کوئی جگاڑ نہیں ہو پایا تھا۔ عید کو اب صرف نو یا دس دن باقی تھے۔ وہ خود بھی روزہ رکھتا تھا اور دن بھر رکشا کھینچتا تھا کہ آٹھ افراد کھانے والے تھے اور وہ ایک اکیلا کمانے والا۔ پچاس سال کی عمر میں اب اس سے زیادہ محنت بھی نہیں ہوتی تھی۔ جلدی تھک جاتا تھا، اوپر سے روزہ..... پھر بھی اُس کو اللہ کی ذات سے امید تھی کہ کہیں نہ کہیں سے بچوں کے لئے عید کے جوڑے کا انتظام ہو ہی جائیگا۔

اچانک دھڑام کی آواز کے ساتھ اُس کی سوچ کا دھاگہ ٹوٹا اور اُس کا رکشا سامنے سے آتے ہوئے ٹرک سے ٹکرا گیا۔ پھر وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہ رہا۔ بیہوشی کی حالت میں نو دن تک سرکاری ہسپتال میں موت سے لڑتا رہا اور چاند رات کی رات کو..... ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

عید کی نماز کے بعد اُسکے جنازے کی نماز ادا کی گئی۔ وہ مرتے مرتے بھی عید منا گیا۔ ہم عید میں خود اپنے ہاتھوں سے نہاتے ہیں، پہنتے ہیں مگر واہ ری قسمت محمد عثمان غنی کی..... اُس کی عید سب سے نرالی تھی، اُسے ہم سبھوں نے مل کر نہلایا، سجایا، سنوارا اور پھر اپنے کندھوں کی سواری پہ لے جا کر اُس کی منزل مقصود پہ چھوڑ آئے۔ ایسی عید تو قسمت والوں کی ہوتی ہے میاں.....!!

☆☆☆

عید کی نماز

پروفیسر سبزواری صاحب کی بیگم کا منہ پھول کے اور بھی بڑا ہو گیا تھا۔ کل عید ہے مگر ابھی تک ان کا چکن دردوزی والا ڈریس نہیں آیا تھا۔ فیشن ڈیزائنر نے تو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کام کی بہت بھیڑ ہے، عید کے لئے لوگوں نے رمضان سے پہلے ہی آرڈر کر رکھا ہے۔ اگر وقت ملا تو میڈم کا ڈریس ہو جائیگا ورنہ.....!

عید کی صبح سے پروفیسر سبزواری صاحب اپنی بیگم کو سمجھانے میں لگے تھے کہ کیا ہوا جو وہ ڈریس نہیں بن پایا۔ تم نے جو پانچ ہزار والی بنارسی ساڑھی خریدی ہے عید کے لئے، وہی پہن لینا۔ دیکھنا اپنی سہیلیوں میں سب سے زیادہ خوبصورت تم ہی لگو گی۔ ویسے بھی تمہارے بھاری بھرکم بدن پہ ساڑھی ہی زیادہ شوٹ کرتی ہے۔ جوان بچوں کے سامنے ڈریس پہن کر تم اور بھی عجیب لگتی ہو۔ بس اتنا ہی کہا تھا پروفیسر صاحب نے کہ ان کی بیگم ہتھے سے اُکھڑ گئیں۔ (عورت کی عمر اور صحت پہ کبھی بھی کمینٹ نہیں کرنا چاہئے).....تمتماتے ہوئے جان دینے کے لئے اپنے بیڈروم میں گھس گئیں۔ پروفیسر صاحب ان کے پیچھے دوڑے.....دروازے کے سامنے گڑگڑاتے رہے.....مناتے رہے.....معافی مانگتے رہے.....اپنے الفاظ واپس لیتے رہے مگر.....دروازہ نہیں کھلا۔

اور اُدھر.....عید کی نماز پڑھ کر لوگ گھروں کو واپس بھی ہو گئے.....!!

☆☆☆

چاٹنگ

لڑکا: ہائے.....سوئٹ ہارٹ! کیسی ہو؟ یو آر ٹھولیٹ.....کب سے آن لائن ہوں۔

لڑکی: اوہ مائی ڈارلنگ.....آئی ایم سوری! کیا کروں، بھیا اپنی GF (گرل فرینڈ) کے ساتھ چاٹ کر رہے تھے تو میں کیسے آتی.....گھر میں ایک ہی تو کمپیوٹر ہے۔ تم سناؤ کیسے ہو؟ لگتا ہے رات بھر نیند نہیں آئی.....کل رات کی ہاٹ چاٹنگ کے بعد مجھے بھی.....

لڑکا: اوہ.....مائی سوئٹ بے بی! نیند کس کم بخت کو آئے گی.....تم نے آج اپنی فوٹو دکھانے کی بات کہی تھی تو میں رات بھر.....تمہارا خیالی سراپا بنا رہا تھا۔ تم ایسی ہوگی.....تم ویسی ہوگی، تمہارا فیس ایسا ہوگا اور تمہارا فیگر.....

لڑکی: ہاں.....ہاں.....بولو نا، رک کیوں گئے۔ کیسا ہوگا میرا فیگر؟ Guess it Yaar

لڑکا: دیکھو ہنی.....اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا، ہم دو مہینے سے چاٹ کر رہے ہیں مگر میں تمہارے بارے میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ تم میرے ہی شہر کی ہو، عمر بیس سال ہے اور تمہارا نام مونیکا ہے (پتہ نہیں یہ سب بھی صحیح ہے یا غلط)۔

لڑکی: جانو! تم مجھ پہ شک کر رہے ہو۔ بھول گئے ہم نے کتنی پیار بھری چاٹنگ کی ہے، میں نے تمہیں اپنے ہر افیئر اور BF کے بارے میں بتا دیا ہے۔ تم ممبئی میں جاب کرتے ہو تو کیا ہوا؟ ہم دونوں ایک ہی شہر کے تو ہیں نا؟ اس لئے فوٹو دکھانے سے کترا رہی تھی۔ مگر اب مجھے تم پہ مکمل بھروسہ ہے، جلدی سے آجاؤ جانو.....اب چاٹنگ سے دل نہیں بھرتا.....اب تو ڈیٹنگ پہ جانا چاہتی ہوں۔ دل تھام کے بیٹھو.....میں اپنی فوٹو Send کر رہی ہوں

اور فوٹو دیکھنے کے بعد.....رادھے شیام شرما جی نے سچ مچ دل تھام لیا تھا۔

کمپوٹر اسکرین پر مونیکا کا چہرہ دمک رہا تھا مگر شرما جی کے دل و دماغ میں.....زلزلے کی دھمک سنائی دے رہی تھی۔ ان کی چاٹنگ GF مونیکا کوئی اور نہیں.....ان کی اپنی بیٹی وندنا تھی.....!!

آخر بیٹیاں اتنی جلدی بڑی کیوں ہو جاتی ہیں؟؟؟

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

ایڈیٹر' کوہسار جرنل'، بھاگلپور، بہار

"..... منیر ارمان نسیمی اس حقیقت سے واقف ہیں کہ انسان کے احساس کو زندہ رہنے کے لئے وجود کی آفاقی حیثیت روشن رکھنا پڑتا ہے۔ ان کی شاعری اور انشائیہ نگاری احساسات کی رنگ برنگی تتلیوں کو پکڑنے کی کامیاب کوشش ہے۔ عصری حسیت سے مزین منہ بولتی تصویر پیش کرنے کا ہنر وہ جانتے ہیں۔ منیر ارمان نہ صرف زبان دانی اور مخصوص طرزِ بیان سے کام لیتے ہیں بلکہ مزاح میں طنز کا خوب خوب مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ ماحول اور کیفیت کے مطابقت اور کردار سے ہم آہنگ ہوجانے والی زبان کا استعمال کرتے ہیں جو قاری کے ذہن میں ایک خوشگوار اثر چھوڑ جاتی ہے۔ وسیع کینوس پر جس طرح کے نقوش وہ ابھارتے ہیں، یقیناً متوجہ کرتے ہیں۔ کیونکہ اسی میں ان کی مقصدیت اور معنویت ہے۔ منیر ارمان سے مستقبل میں کافی امیدیں وابستہ ہیں!"

''ہاڑی میاں...... جس کا اصل نام تو شائد اب خود اُسے بھی یاد نہیں ہوگا۔ عمر ساٹھ کے قریب، اونچا قد، دبلا پتلا جسم، چوڑی پیشانی، لمبی ناک، لومڑی کی طرح ہمیشہ تھر کنے والی آنکھیں، سر اور داڑھی کے بال بلیک اینڈ وایٹ، ماتھے پر سجدے کا بڑا سا نشان جو ... لگانے سے نہیں بلکہ رگڑنے سے بنا تھا اور اجنبی لوگوں کو مرعوب کر دیتا تھا کہ یہ آدمی ضرور اللہ کا نیک بندہ ہے۔''

منیر ارمان نسیمی کے انشائیے کی ایک بڑی خوبی اُس کا ایک توازن بھی ہے وہ نہ تو کسی موضوع کو اس قدر پھیلاتے ہیں کہ وہ قاری کے لیے بوجھ بن جائے اور نہ ہی اس قدر مختصر لکھتے ہیں کہ ایک تشنگی کا احساس رہ جائے۔ تحریر کا یہ اعتدال اُن کے اِس فنی رکھ رکھاؤ کی وجہ ہے کہ وہ اپنے تخلیقی سفر میں محض اکیلے نہیں بلکہ قاری کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ تخلیقی ذمہ داری بلاشبہہ قابل ستائش ہے۔

ٹی۔ ایس۔ ایلٹ کے مطابق اچھی شاعری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ پڑھنے میں اچھی لگتی ہے۔ منیر ارمان نسیمی کی نثر اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ اُن کے انشائیے میں لطافت، نرمی اور شیرنی ہی نہیں بلکہ ایک شرارتی بے ساختگی بھی ہے۔ اُن کی تحریر اُس آئینہ خانے کی طرح ہے جس میں اُن کی حقیقت شناس نظر انتہائی شگفتگی سے معاشرے کے خاص و عام کرداروں کے ظاہری و باطنی قد کو نمایاں کر دیتی ہے۔ وہ قاری کے لبوں کو اسی طرح اچانک مسرت سے ہمکنار کر دیتی ہے جس طرح کبھی کبھار سارے دن کے پر مشقت دن کے بعد اُن کے انشائیے کے شگفتہ جملے کسی ملائم خیال کی طرح مجھے اچانک یاد آجاتے ہیں اور زیر لب مسکرانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

☆☆☆

☆ ڈاکٹر بلند اقبال
کینیڈا

منیر ارمان نسیمی اُڑیسہ کے تاریخی شہر بھدرک کے ایک معزز، علم دوست گھرانے میں، ہردلعزیز اُستاذی شیخ ممتاز الدین حبیبی کے گھر پیدا ہوئے۔ میٹرک تک آتے آتے غزل کہنے لگے تھے۔ مگر والد صاحب کے ڈر سے جریدوں اور اخباروں میں چھپ چھپا کر ''خاکی نسیمی'' کے قلمی نام سے شائع ہوتے رہے۔

منیر ارمان نسیمی ۱۹۹۰ء کو اپنی ادبی زندگی کا بہت اہم سال مانتے ہیں جب انہیں حضور چھوٹے سرکار سیّد وسیم القادری صاحب قبلہ (ماما جی) کی سرپرستی نصیب ہوئی۔ اور آپ ہی کے وسیلے سے اُستاد الشعرا پدم شری جناب بیکل اُتساہی صاحب کی شاگردی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ سہ ماہی ''روزن'' بھدرک سے عملی طور سے جُڑنے کے بعد **منیر ارمان** کو دنیا بھر کے مستند شاعر، ادیب، ناقد اور خاکہ نگاروں سے شناسائی ہوئی اور انکی کاوشوں کے مطالعہ سے انکی ادبی زندگی میں ایک نئی تحریک نے جنم لی۔ اُن میں سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی صاحب نے انہیں کافی متاثر کیا۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ..... ''مناظر بھائی میرے لئے تھری اِن وَان..... گائیڈ، دوست اور استاد ہیں۔ میں شاعری کرتا تھا، مجھے انشائیہ نگاری کی طرف مناظر بھائی ہی لے کر آئے۔''

منیر ارمان نسیمی بے حد ملنسار اور نہایت ہی سُلجھے ہوئے نوجوان ہیں۔ ایک سماجی فلاحی ادارے میں کمیونیکیشن افیسر ہیں۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ ملک اور بیرون ملک کے معتبر رسائل و جرائد میں شائع ہو رہے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں مگر دیگر اصناف سُخن میں بھی ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔ زندگی کے سخت و شیریں تجربات، موجودہ سیاسی حالات، سماجی بے راہ روی اور انسانی قدروں کی پامالی انکے انشائیے کے موضوع ہیں۔ طرز تحریر کی دلکشی، سادگی اور عام لوگوں میں بولے جانے والی زبان قاری کو فوراً متاثر کرتی ہے۔ انگریزی میں بھی کئی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ایک تحقیقی کتاب ''طلاق شدہ مسلم عورتوں کی سماجی اور اقتصادی حالات'' (انگریزی) پر انٹرنیشنل پبلیشنگ ہاؤس نے ایوارڈ سے نوازا ہے۔ انٹرنیٹ پہ بھی انکے مضامین، انشائیے اور شاعری کئی ویب سائٹس پہ آ رہے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''میں سورج کا چہرہ ہوں'' زیر طبع ہے..... اور انشائیوں کا مجموعہ ''آ بیل مجھے مار'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان کا ادبی سفر اسی آن بان سے چلتا رہا تو وہ بہت جلد نئی نسل کے اچھے انشائیہ نگاروں میں اپنا مقام بنا لیں گے!

.....سمن نسیمی

Munir Armaan Nasimi

Nasimi Manzil. Chota Shakarpur. Bhadrak-756100 [Orissa] India.

Mobile: 09937123856, E-mail: armaan28@yahoo.com

http://munir-armaan.tripod.com

اردو کے مزاحیہ ادب میں عمدہ اضافہ

سہیل احمد صدیقی

ہر چند کہ میرا شمار ثقہ ناقدین یا طنز و مزاح نگاروں میں نہیں ہوتا اور میں محض طنز و مزاح کا ادنیٰ قاری ہوں، مضامین کہ شاید کچھ تنقیدی ہوتے بھی ہیں، عموماً عام شاعری یا نثر سے متعلق کتب یا موقع کے لحاظ سے ہائیکو پر خامہ فرسائی کا نمونہ ہوا کرتے ہیں۔ منیر ارمان نسیمی سے میرا تعارف بھی بذریعہ انٹرنیٹ ہوا۔ ان کی نگارشات بھی کم ہی دیکھ سکا ہوں، وجوہ جو بھی ہوں، مگر جب انہوں نے بصد اصرار مجھے اپنے انشائیے ارسال فرما کر اظہار خیال کی دعوت دی تو میں انکار نہ کر سکا۔

منیر ارمان نسیمی اردو کے نثری ادب میں بحوالہ طنز و مزاح عمدہ اضافہ ہیں۔ یہ بات میں رسماً نہیں کہہ رہا جیسا کہ عموماً نقاد فلیپ لکھتے ہوئے فرما جاتے ہیں۔ ان کے انشائیے پڑھ کر میں نہ صرف محظوظ ہوا بلکہ یہ سوچنے پر مجبور بھی ہوا کہ..... ''پرکا کو ابنانے'' اور ''رائی کا پہاڑ'' یا..... ''کوزے میں دریا بند کرنے'' کے حوالے سے محض شاعروں کو 'بدنام' کرنا بے جا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی بات سے کوئی بڑا مضمون پیدا کرنا اچھے نثر نگار خصوصاً طنز و مزاح نگار کے لیے بائیں ہاتھ کا کام ہے اور منیر ارمان نسیمی صاحب اس میں کمال رکھتے ہیں!

منیر ارمان نسیمی صاحب جزئیات نگاری کے قائل ہیں مگر فضول تفصیل سے گریز بھی کرتے ہیں۔ انہیں یہ معلوم ہے کہ انشائیہ (خصوصاً مزاحیہ) لکھتے ہوئے اپنے گرد و پیش سے مواد حاصل کرنا کس قدر ضروری ہے۔ مثال دینے سے خواہ مخواہ قاری مرعوب یا متاثر ہوگا' لہٰذا میں اس سے گریز کرتا ہوں۔ منیر ارمان نسیمی سے مستقبل میں کافی امیدیں وابستہ ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

☆ مدیر ہائیکو انٹرنیشنل،
کراچی (پاکستان)

جیتے جاگتے زندگی سے بھرپور انشائیے

رضی الدین رضیؔ

منیر ارمان نسیمی کا شمار بھارت کے اُن نوجوان سخنوروں میں ہوتا ہے جن کا نام بہت مختصر وقت میں ادبی افق پر نمایاں ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی محنت اور لگن سے مختلف اصنافِ ادب میں اپنی پہچان بنائی ہے۔ شاعری میں وہ اپنے منفرد لب و لہجے اور تیکھے اندازِ تکلم کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ خوشی اس بات کی ہے کہ وہ صرف شاعر ہی نہیں خوبصورت نثر نگار بھی ہیں اور نثر میں اظہار کیلئے انہوں نے انشائیے کو وسیلہ بنایا۔

منیر ارمان نسیمی کے انشائیوں میں سب سے اہم بات ان کی بے ساختگی، بیباکی اور موضوعات کا تنوع ہے۔ وہ بات کرنے کا ڈھب جانتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ موضوع کیسے چننا ہے اور چھوٹی سی بات کو آگے کیسے بڑھانا ہے۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے موضوعات، واقعات اور کرداروں کو منیر ارمان نسیمی نے بالکل نئے زاویے سے دیکھا ہے اور اپنے اچھوتے انداز سے قاری کو بھی نئے جہان کی سیر کروائی ہے۔

منیر ارمان نسیمی نے اپنے انشائیوں میں بڑی بے تکلفی کے ساتھ بات کی ہے۔ محاوروں کے استعمال اور شگفتہ مزاجی سے کہیں بھی قاری کو اکتاہٹ کا شکار نہیں ہونے دیا ہے۔ خوشی اس بات کی بھی ہے کہ وہ شاعر ہونے کے باوجود انشائیوں کا مجموعہ پہلے لا رہے ہیں۔ میری تمام دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ **اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!**

☆ روزنامہ 'جنگ'
ملتان، پاکستان

"آبیل مجھے مار" کی شاندار اشاعت پر ہم
جناب منیر ارمان نسیمی صاحب کو
صمیمِ قلب سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

یا خدا کامیاب کوشش ہو
عشق کی راہ میں نہ لغزش ہو

ادبی مرکز، بھدرک

بانی وسرپرست: وسیم القادری، مدیر اعلیٰ سہ ماہی "روزن"
گلشن غوث پاک، سرکار نگر، بھدرک (اڑیسہ) انڈیا

- بھدرک میں اردو زبان وادب کا فروغ
- ہر ماہ پابندی کے ساتھ ادبی نشست کا انعقاد
- پرائمری اور ہائی اسکول کے طلباء کے لئے اردو مضمون نویسی، بحث ومباحثہ اور خوشخطی کے مقابلے کا اہتمام
- نعتیہ مقابلہ، مشاعرہ، سیمینار، کانفرنس کا انعقاد
- اردو زبان وادب کے فروغ کے لئے ہر جائز کام اور کوشش کرنا اور.....ایسی تنظیموں کی مدد کرنا جو اردو کے لئے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔

آپریشن لُوٹ مار!

ارے بھئی سُنیئے! دیکھیئے..... آپ بالکل ڈریئے مت۔ میں آپ سے کسی ملٹری آپریشن کی بات نہیں کر رہا اور نہ..... کشمیر کے مسئلے کا ذکر کر رہا ہوں، جو آپ منہ پھیر کر بھاگ رہے ہیں۔ وہاں تو ہر آپریشن زخم کو بھرنے کے بجائے کچھ اور گہرا کر جاتا ہے، درد کمنے کے بجائے اور بڑھ جاتا ہے۔ اب تو ناسور بن چکا ہے۔ میں تو آپ سے صرف اُن آپریشن کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو آئے دن ہمارے گاؤں میں، قصبوں میں، شہروں میں، مہانگروں میں سفید لبادے میں ڈھکے وہ بے رحم قصائی کرتے ہیں جنھیں عرف عام میں ہم ڈاکٹر کہتے ہیں (کچھ ایک فرشتہ صفت ڈاکٹروں کو چھوڑ کر!)

آپ کا یہ خاکسار بھی ایک بے رحم آپریشن کی پیداوار ہے۔ بے رحم اس لئے کہ ڈاکٹر لوگوں کے دل سے، ٹریننگ کے وقت 'رحم' نام کا جرثومہ نکال دیا جاتا ہے۔ اتنا سفاک اور بے درد بنا دیا جاتا ہے کہ انسان کو کاٹتے، پھاڑتے وقت وہ چیونگم چباتے رہتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ خود بھی ایک انسان ہیں۔ میری ماتا جی کا ایسا آپریشن کیا کہ وہ زندگی بھر دوسری اولاد کے لئے ترستی اور تڑپتی رہیں اور ایک دن تھک ہار کر بھگوان کے پاس اپنی شکایت درج کروانے چلی گئیں۔ میں زندگی بھر بھائی، بہن کی محبت کو ترستا رہونگا اور جب جب بھی موقع ملے گا ان سفید لباس کے اندر چھپے کالی بھیڑوں کو آپ کے روبرو کرتا رہونگا۔

آپریشن کے نام پر ایسے ایسے خرافات یہ لوگ کر جاتے ہیں کہ کیا بتاؤں۔ ابھی کل ہی اخبار میں آیا ہے کہ ایک پچپن سال کی عورت کے پیشاب میں بینڈ یج کا کپڑا نکلا۔ بیچاری تین ماہ سے درد کے بستر پر تڑپ رہی تھی، وہ بھی آپریشن کے بعد۔ ہوا یوں کہ تین ماہ پہلے اس

عورت کے پیٹ کے نچلے بھاگ میں درد اٹھنے لگا۔ پہلے نیم حکیموں نے کوشش کی، پھر کیمسٹ والوں سے کہہ کر دوا کھلائی گئی مگر درد نہ حد سے گزرا.....اور نہ دوا ہوا۔ پھر جب وہ عورت کچھ کرنے کے قابل نہ رہی تب اسکے گھر والوں نے اسے ڈاکٹر کو دکھانے کا سوچا۔ یہ بھی ایک المیہ ہے کہ ہم اپنے گھر کی عورتوں کی بیماری کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ اگر عورت بہو ہے، دوسرے کی بیٹی ہے تو اسکی بیماری کو اسکا کام نہ کرنے کا بہانہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں اور اگر ماں ہے یا بہن ہے تو یہ سوچ کر کہ عورتوں کے ساتھ تو یہ سب ہوتا رہتا ہے، ہم علاج کرنا بھول جاتے ہیں۔ یا پھر زیادہ سے زیادہ کسی دوائی کے دوکاندار سے زبانی کہہ کر دس پانچ روپئے کی دوا لا دیتے ہیں۔ ہماری آنکھ تب کھلتی ہے جب وہ عورت بیماری سے لڑ جھگڑ کر بستر سے لگ جاتی ہے اور ہماری پیٹ پوجا کا بندوبست نہیں ہو پاتا ہے۔ بھوک کیا کیا نہ کروالیتی ہے انسانوں سے!

ہاں تو..... جب اس عورت کو اسکے گھر والے ہسپتال لیکر گئے تو وہاں ایک ڈاکٹر سے دوسرے ڈاکٹر، دوسرے سے تیسرے ڈاکٹر کا چکر لگاتے ہوئے انھیں چکر آنے لگے۔ تھک ہار کر بیچارے ایک فرشتہ صفت دلال کے مشورے پر سرکاری ہسپتال کے ڈاکٹر صاحب کے پرائیوٹ نرسنگ ہوم میں بھرتی ہو گئے۔ پھر اُس مسیحا نے جو جو ٹیسٹ کرنے کو کہا ان لوگوں کو کرانا پڑا۔ آخر دو دن بعد اس عورت کا اپینڈکس پکڑا گیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ فوراً آپریشن کروانا پڑیگا ورنہ.....؟؟ آگے سوچنے کے لئے وقت ہی کہاں تھا گھر والوں کے پاس زمین کا ایک ٹکڑا تھا اسے بیچ کر بیس ہزار کی رقم کا بندوبست کیا گیا۔ دوسرے دن اس عورت کا آپریشن صبح دس بجے شروع ہوا۔ گیارہ بجے کے قریب ہسپتال سے ایک جونیئر ڈاکٹر دوڑتا ہوا آیا اور آپریشن تھیٹر کے اندر گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد آپریشن کرنے والے ڈاکٹر صاحب ہسپتال کی طرف دوڑے، مریض کو جونیئر کے حوالے کر دیا۔ گھر والے بیچارے نرسنگ ہوم کے باہر آرمی پیریڈ کرتے رہے۔ بارہ بجے کے بعد ڈاکٹر صاحب ہسپتال سے آئے اور آپریشن تھیٹر میں چلے گئے۔

آخر کار ایک بجے کے قریب آپریشن مکمل ہوا۔ ڈاکٹر صاحب ماتھے کا پسینہ نگاڑتے

ہوئے باہر آئے۔ مریض کے گھر والے انکے پاس دوڑے کہ کچھ حال چال پوچھیں مگر ڈاکٹر صاحب نے دور سے ہی اپنے گلے پر ہاتھ پھراتے ہوئے ٹھنڈا لانے کو کہا۔ مریض کا ایک رشتے دار دوڑا ٹھنڈا لانے۔ آپریشن کامیاب ہوا ہے، یہ جانفزا مژدہ ڈاکٹر صاحب نے تب سنایا..... جب بیس ہزار کی رقم ان کے ہاتھ میں نہیں آ گیا۔ اُس مریض عورت کو گھنٹہ بھر بعد جب ہوش آیا تو وہ پہلے سے زیادہ درد کی شکایت کرنے لگی۔ ڈاکٹر نے یہ کہہ کر سمجھا دیا کہ چیر پھاڑ..... مطلب آپریشن ہوا ہے تو اس کی وجہ سے درد ہو رہا ہے۔ ایک دو دن میں سب ٹھیک ہو جائیگا۔ دوسرے دن واپس گھر جانے کی اجازت مل گئی مگر..... درد کو اچھا نہ ہونا تھا وہ نہ ہوا۔ اب تو گھر والے بھی اسکے درد اور اُسکی کراہ کو سن کر چپ رہنے لگے تھے۔ بے چاری عورت..... درد، زخم، تڑپ اور صبر جسکا دوسرا نام ہے..... کر بھی کیا سکتی ہے۔ آخر کب تک چُپ رہیگی یہ عورت؟؟!

دو مہینے اس طرح درد سے تڑپتے گزر گئے۔ جب بھی ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کیا گیا انھوں نے فیس لینے کے بعد دو چار دوائی اور لکھ دی۔ درد اب برداشت سے باہر ہونے لگا تھا۔ تب گھر والوں نے ایک پڑوسی کا مشورہ مان کر مہانگر کے ایک بڑے ڈاکٹر کو دکھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ ڈاکٹر، ایک فرشتہ صفت انسان تھا (بس ان ہی لوگوں کی وجہ سے آج بھی لوگوں کا بھروسہ ڈاکٹروں پر قائم ہے!)۔ انھوں نے تمام رپورٹ دیکھنے کے بعد، عورت کے پیٹ کا الٹرا ساؤنڈ کیا تو انہیں پتہ لگا کہ پیٹ کے اندر کچھ ہے۔ انہوں نے گھر والوں کو فوٹو دکھایا اور کہا کہ اسے نکالنے کے لئے ایک بار پھر آپریشن کرنا پڑیگا۔ مطلب ایک آپریشن کی بھول کو سُدھارنے کے لئے..... دوسرا آپریشن!

گھر والوں نے روپیہ جُگاڑ کرنے کا کہہ کر ڈاکٹر صاحب سے ایک ہفتے کا وقت مانگا اور صرف دوائی لے کر چلے آئے۔ اس کے ٹھیک تیسرے دن اس عورت کے پیشاب میں وہ بینڈیج کا کپڑا نکلا جو دو مہینے پیٹ کے اندر رہنے کی وجہ سے گل سڑ گیا تھا۔ گھر والے تو سمجھ نہیں پائے مگر جب مہانگر والے ڈاکٹر کے پاس دوڑے آئے تو انھوں نے بتایا کہ پہلی بار آپریشن

آ بیل مجھے مار!

(انشائیے اور افسانچے)

منیر ارمان نسیمی

زیر اہتمام

روزن پبلیکیشن

سرکارنگر، بھدرک، اڑیسہ-۷۵۶۱۰۰ (انڈیا)

کے وقت، ڈاکٹر صاحب یہ بینڈ یج کا ٹکڑا پیٹ سے نکالنا بھول گئے ہوں گے اور پیٹ سی دیا ہوگا۔ اس کی وجہ سے درد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اب وہ بے چاری عورت ٹھیک ہے مگر ایک سماج سدھارک نے اس عورت کی طرف سے ایک کیس داخل کیا ہے اور وہ بھولے بھالے ڈاکٹر صاحب، اپنے ایک رشتے دار کے گھر میں چھپ کر، پولس کی نظر میں فرار ہیں۔

آپ نے یہ تو ضرور سُنا ہوگا کہ پچھلے سال جو سب سے بڑا ٹرین حادثہ ہوا تھا۔ ہمیں پتہ ہے آپ سوچ میں پڑ گئے ہونگے کہ کونسا حادثہ؟ کیونکہ آج کل بھارت میں ٹرین اور حادثہ.....ایک ہی سکّے کے دو پٹ ہیں، روز اتنے سارے حادثے ہو رہے ہیں کہ چھوٹا کون اور بڑا کون تمیز کرنا مشکل ہے۔ میں اُس حادثے کی بات کر رہا ہوں جس میں سوپر فاسٹ راجدھانی یکسپریس پُل ٹوٹ جانے کی وجہ سے ندی میں گر گئی تھی اور کم و بیش ۲۶۰ انسانوں کی جان چلی گئی تھی (یہ سرکاری گنتی ہے ورنہ جائے واردات کے چشم دید گواہوں کا بیان اسکا دوگنا ہے)۔ ابھی چند دن پہلے ٹیلی ویژن سے یہ خبر سُن کر کہ اس حادثے میں مرے ہوئے لوگوں کی آنکھ، کڈنی اور نہ جانے کیا کیا نکال کر ڈاکٹروں نے بیچ دیئے۔ اپنے انسان ہونے پر مجھے شرمندہ ہونا پڑا۔ جانور بھی اتنی شرمناک بات سوچ نہیں سکتے جو ان ڈاکٹروں نے کیا۔ کیا یہ مسیحائی ہے؟ اگر میں انھیں قصائی کہتا ہوں تو کیا غلط ہوں؟؟

اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس بات میں کتنی سچائی ہے مگر یہ خبر اخبار میں آئی تھی کہ ایک غلط آپریشن (یا غلط ڈاکٹر) کی وجہ سے ایک معصوم عورت کی طلاق ہوگئی، بیچاری چار بچوں کے ساتھ در بدر ہو رہی ہے، اسکے اپنے ماں باپ بھی اسے اپنانے کو تیار نہیں۔ ہوا یوں کہ کچھ سال پہلے سرکار کی طرف سے فیملی پلاننگ کو بڑھاوا دینے کے لئے، کئی اسکیم چالو کئے گئے تھے۔ ان میں ایک تھا Vasectomy یعنی مردوں کا آپریشن (فیملی پلاننگ کے لئے صرف عورت ہی کیوں؟)۔ جو مرد اپنا آپریشن کرواتے تھے انھیں سرکار کی طرف سے روپیہ اور ایک کارڈ ملتا تھا جس سے انھیں بہت ساری چیزوں میں سہولت ملتی تھی۔ تو ہمارے عقیل صاحب (فرضی نام) بھی لالچ میں، چار بچوں کے بعد، اپنا آپریشن کروانے کو تیار ہوگئے۔ ایک ساتھ بیس مردوں کا آپریشن ہوا، اخباروں میں ان

مردوں کی تعریف کے پُل باندھے گئے تا کہ دوسرے مرد بھی آگے آئیں اور اپنا آپریشن کروا کے، ملک کی ترقی میں ہاتھ بٹائیں۔ بیس مردوں کا آپریشن کرنے کے لئے مہانگر کے میڈیکل کالج سے ڈاکٹروں کی ٹیم آئی۔ آپریشن ہوا اور سب اپنے اپنے گھر لوٹ گئے۔ پانچ یا چھ مہینے کے بعد اچانک عقیل صاحب کی اہلیہ کو اُلٹیوں کا دورا پڑا۔ کالا نمک، نیبو پانی وغیرہ سے کام نہیں چلا تو..... ایک لیڈی ڈاکٹر کو دکھایا گیا، اس نے آدھے گھنٹے تک سب طرف ٹٹولنے کے بعد..... پیشاب ٹیسٹ کروانے کا مشورہ دیا اور پچاس روپیہ لیکر ہنس کے وداع کیا۔ مگر ٹیسٹ کی رپورٹ آئی تو سب کے چہروں سے ہنسی غائب ہوگئی۔ عقیل صاحب کی اہلیہ ماں بننے والی ہیں سُن کر..... گھر میں کُھسر پسر شروع ہوگئی۔ ایک کان، دو کان، تین کان ہوتی ہوئی یہ بات جب عقیل صاحب کے کان تلے آئی تو وہ..... غصّے، شرم، غیرت اور نہ جانے کیا کیا کی وجہ سے تھرتھرانے لگے۔ انھوں نے اپنی اہلیہ کے بالوں کو پکڑ کر ایک جھٹکا دیا کہ وہ بلبلانے لگیں۔ گرج کر بولے ''بتا، کس کا ہے؟'' بیوی بیچاری کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا بولی ..... ''آپ پگلا گئے ہیں کیا، یہ بال میرے ہیں، آپ کو نظر نہیں آرہا جو پوچھ رہے ہیں کس کا ہے؟''۔ انکا غصہ اب تالو پھاڑ کے باہر نکلنے کو تھا، شیر کی طرح دھاڑ کر بولے..... ''میں تیرے بال کی نہیں، پیٹ میں پل رہے بچے کی بات کر رہا ہوں۔ بتا کس کا پاپ ہے یہ؟ میں تو آپریشن کرا چکا ہوں پھر یہ آیا کدھر سے؟؟''۔ معصوم بیوی بھلا کیا جانے (آپریشن میں گڑبڑ جونیئر ڈاکٹروں سے ہوئی اور جواب اس سے مانگا جارہا ہے)، اس نے کہہ دیا کہ میں کیا جانوں کدھر سے آیا، جیسے چار بچے آئے یہ بھی اللہ کی طرف سے آیا ہوگا۔ اتنا کہنا تھا کہ عقیل صاحب کے صبر کا باندھ دھڑ دھڑا کے ٹوٹ گیا۔ چاروں ہاتھ پاؤں سے ٹوٹ پڑے، اپنے چار بچوں کی امّاں پہ۔ گھر کے لوگ جمع ہوگئے، جس نے بھی سُنا اُس نے چھی چھی کیا، سب کے سب عقیل صاحب کے آپریشن کے بارے میں جانتے تھے اسلئے تمام قصور بیچاری صابرہ بی بی کے سر لگا اور عقیل صاحب نے اپنی بدچلن (؟) بیوی کو طلاق دیدی۔ بعد میں عقیل صاحب نے ایک بے آسرا بیوہ سے شادی کرلی جو بنا بچوں کے تھیں، مگر اتفاق کی بات ہے کہ وہ بھی ماشاءاللہ ایک سال کے اندر حاملہ ہوگئیں۔ اب ہمارے عقیل صاحب کی عقل ٹھکانے آئی، سوچا کہ ہو نہ ہو میرے میں ہی کوئی گڑبڑ ہے۔ جب ایک بڑے ڈاکٹر سے جانچ کروایا تو پتا چلا کہ نس بندی کا

آپریشن ہی غلط ہوا ہے اور انکی اہلیہ کے حاملہ ہونے میں کسی اتفاق کا ہاتھ نہیں بلکہ خود انکا ہی ہاتھ ہے۔ اب بے چارے عقیل صاحب کریں تو کیا کریں؟ صبر کی دیوی صابرہ بی بی کو طلاق دینے کا دُکھ انھیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے، سوکھ کر کانٹا ہو چکے ہیں اور سُنا ہے ہر نماز کے بعد اُس ڈاکٹر کو بد دعا دیتے رہتے ہیں!

کیا آپ یقین کریں گے کہ میرے ایک دوست کے والد صاحب کے دائیں آنکھ میں موتیا ہو گیا تھا۔ ایک سماجی فلاحی ادارے کے طرف سے ہمارے شہر میں مفت آئی کیمپ لگا تھا۔ میں نے اپنے دوست کو سمجھا کر، انکے والد صاحب کو وہاں بھیجا کہ انکا آپریشن ہو جائیگا تو وہ دونوں آنکھوں سے دیکھنے لگیں گے مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ آپریشن کے بعد میرا دوست میری طرف سے دونوں آنکھیں بند کر لے گا اور میرا نام کسی کے مُنھ سے سنتے ہی..... کتے کی طرح کاٹنے کو دوڑیگا۔ ہوا یوں کہ دوست کے والد صاحب کا آپریشن جس ڈاکٹر نے کیا وہ شاید اونچا سُنتا تھا..... دائیں آنکھ کی جگہ بائیں آنکھ کا موتیا نکال دیا۔ پہلے تو بے چارے دائیں سے دیکھ نہیں سکتے تھے اب..... بائیں آنکھ سے بھی محروم ہو گئے ہیں اور میں..... ایک بہت ہی پیارے دوست کی دوستی سے!!

معروف انشائیہ نگار اور مشہور شاعر

جناب منیر ارمان نسیمی کو

''آبیل مجھے مار'' کی شاندار اشاعت پر دل کی گہرائیوں سے

مبارکباد پیش کرتے ہیں!

With Best Wishes From:

AKHIL BHARATIYA DUKHI SAMAJ

Gulshan-e-Ghouspaak, Sarkar Nagar, Bhadrak

(ORISSA] INDIA.

بڑے میاں

بڑے میاں کو دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ بڑے میاں ہیں۔ شاید پیدا ہوتے وقت عام بچوں سے تھوڑے بڑے پیدا ہوئے ہونگے اور کسی رشتے دار نے ازراہِ مذاق کہہ دیا ہوگا اور یہی نام ان کے ماتھے سے چپکا رہ گیا۔ چار فٹ کا قد، چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں اور آنکھیں، اُن کے نیچے چھوٹے سائز کا امرود جیسا ناک، موٹے موٹے ہونٹ اور ایک بڑا سا سَر ..... جو ان کی شخصیت کا ٹریڈ مارک ہے اور جسکی وجہ سے لوگ انہیں بڑے میاں کہتے ہیں!

اب تک یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ غضب آخر ہوا کیسے؟ بڑے میاں کے خاندان میں چودہ پشتوں تک کوئی بھی بندہ یا بندی ..... چھ فٹ سے کم کا نہیں ہوا ہے۔ بڑے میاں کی اُٹھان چار فٹ سے آگے کیوں نہیں بڑھی؟ سُنا ہے کہ ان کی لمبائی (کم لمبائی) کی وجہ سے ان کی والدہ کو نہ جانے کیسے کیسے طعنے سننے کو ملے۔ یہ بھی سنا ہے کہ ماں باپ کی محبت کے بیچ ایک دیوار بھی پیدا ہوگئی تھی جس کے نتیجے میں ہمارے بڑے میاں کے بعد ان کی کوئی اور اولاد دنیا میں نہیں آئی۔ اس لئے ماں نے انھیں اپنی آخری اولاد، اپنے اچھے وقت کی نشانی ..... اپنے شوہر نامدار کی محبت کی آخری کہانی سمجھ کر بہت لاڈ پیار سے پالا۔ دُنیا دھتکارتی رہی مگر ماں کی آغوش نے تھپ تھپایا۔ اس طرح بڑے میاں ..... بڑے ہوئے۔ لمبے تو نہیں ہوئے مگر کھا پی کر چوڑے ضرور ہوگئے۔ جوانی میں تو وہ بالکل کسی خربوزے کی طرح گول مٹول ہوگئے تھے۔ پھولے پھولے گالوں کے درمیان چھوٹی سی ناک اور اسکے نیچے سے جھانکتی مونچھ دیکھ کر، سنجیدہ آدمی بھی مسکرا دیتا تھا اور بیچارے بڑے میاں اس مسکراہٹ کو محبت سمجھ کر دل ہی دل میں کئی قلابازیاں لگا لیتے تھے۔

شادی تو بڑے میاں نے نہیں کی ..... یا اُن سے کسی نے نہیں کی۔ مگر ان کی شادی کی تمنا میں سوکھ سوکھ کر ماں بیچاری اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ تب بڑے میاں کو دال چاول کا بھاؤ پتا چلا۔ بڑے بھائی بہنوں کی فیملی تو والد صاحب کے چہلم سے ہی الگ ہو چکے تھی۔ ایک ماں تھی وہ بھی

دغا دے گئی۔ خدا کا شکر تھا کہ باپ نے ایک حویلی مہر میں ان کی ماں کے نام کر دیا تھا ورنہ بڑے میاں در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے۔ جب بڑی سی حویلی میں بڑے میاں نے اکیلے رات کاٹی تو..... اکیلا پن ان کو کاٹنے دوڑا۔ صبح کی اذان تک جاگتے رہے اور ماں کی آغوش کی گرمی کو یاد کر کر کے آنسو بہاتے رہے۔ سوچا کہ ماں ٹھیک ہی کہتی تھیں..... ''بیٹا للّن! میرے جیتے جی کچھ کام دھندے سے لگ جاؤ ورنہ میرے بعد تمہیں پوچھنے والا کوئی نہ ہوگا''۔ مگر اُس وقت بڑے میاں کو فرصت کہاں تھی؟ جوانی کی مستی میں چور، دن بھر شہر کی مٹر گشتی کرنے اور آتی جاتی رنگین تتلیوں کو گھورنے میں وقت کم پڑ جاتا تھا۔ گھر صرف کھانا کھانے یا سونے کے لئے آتے تھے یا پھر ماں سے پیسے لینے تا کہ فلم دیکھ سکیں۔ فلم دیکھنے کے اتنے شوقین ہو گئے تھے کہ روز بلا ناغہ دیکھتے تھے۔ کوئی دوست نہیں تھا اس لئے فلم کے ہیرو اور ہیروئنیں ہی ان کے خیالی دوست تھے۔ مدھو بالا کے بڑے سچے عاشق تھے۔ اس کی کوئی فلم لگتی تو..... جب تک فلم چلتی تھی تینوں شو دیکھتے تھے۔ گھر کھانے بھی نہیں آتے تھے۔ ہوٹل سے کچھ خرید لیتے تھے، فلم دیکھتے رہتے، کھاتے رہتے۔ ماں بیچاری انتظار سے پریشان ہو کر جب پوچھتی تو کہتے..... ''وہ میں نے مدھو کے ساتھ کھا لیا تھا''۔ اب ماں کو کیا معلوم کہ مدھو کون؟ دوست یا دشمن؟؟ مرد یا عورت؟؟؟

مدھو بالا کے عشق نے بڑے میاں کو شہر میں کافی مشہور کر دیا تھا۔ لوگ انہیں ''یوسف بھائی'' کہہ کر چڑھاتے تھے تو بڑے میاں کی چھاتی فخر سے پھول کر ہمالہ بن جاتی تھی اور وہ خود کو سچ مچ یوسف خان (دلیپ کمار) سمجھنے لگتے تھے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے اگر مدھو بالا کو دنیا میں کسی نے سب سے زیادہ پیار کیا ہوگا تو وہ بیشک ہمارے بڑے میاں ہی ہونگے ورنہ دلیپ کمار نے تو بس پیار کا ناٹک کیا تھا۔ اور کچھ ہو نہ ہو، فلمیں دیکھ دیکھ کر بڑے میاں کی زبان بہت ستھری ہو گئی تھی۔ کسی کو گالی بھی دیتے تھے تو اتنے سلیقے سے کہ سننے والے کو مزہ آجاتا تھا۔ جب کوئی منچلا ہانک لگاتا..... ''یوسف بھائی! تمہاری مدھو بالا نے تو دلیپ کمار کو چھوڑ دیوانند کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے''۔ تو بڑے میاں اپنی محبوبہ کی توہین برداشت نہیں کر پاتے تھے اور غصّے میں دلیپ کمار کی طرح ہاتھ نچا کر کہتے..... ''کون کمبخت کہتا ہے کہ ہماری مدھو بالا نے ایسا ذلیل کام کیا ہے؟ مدھو کبھی ایسا نہیں کر سکتی، وہ جو بھی کریگی بڑے شان سے کریگی۔ تم لوگ دیکھنا ایک دن اس

کی شادی یوسف بھائی سے ہوکر رہیگی اور ہم اس کو مبارکباد دینے بمبئی ضرور جائیں گے''۔ مگر ایسا نہیں ہوا، نہ اسکی شادی یوسف بھائی سے ہوئی اور نہ ہمارے بڑے میاں کبھی بمبئی جا سکے۔ مگر جس دن مدھوبالا نے کشور سے شادی کر لی..... اُس دن بڑے میاں اسپتال ضرور پہنچ گئے۔ فینائل کی پوری بوتل غٹا غٹ پی گئے تھے اور دوڑ کر اسپتال کے بارندے میں گر کر بیہوش ہو گئے تھے۔ کیا کرتے؟ جب ان کی آن، بان اور جان نے یوسف خان کو چھوڑ کر ایک کافر کا ہاتھ پکڑ لیا تو ان کے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا سوائے خودکشی کے۔ اتنا دکھ تو خود مدھوبالا کے ابا جان کو یا ہمارے یوسف خان کو بھی نہیں ہوا ہوگا جتنا ہمارے بڑے میاں کو ہوا تھا۔ اللہ بچائے ایسے خیراتی عشق سے.....!

بڑے میاں نے اپنی پوری جوانی کچھ نہ کرتے گزار دی۔ پہلے حویلی کا نچلا حصہ کرائے پر لگایا۔ کرائے کی کمائی سے زندگی کی گاڑی چلاتے رہے اور مدھوبالا کے پیچھے لٹاتے رہے۔ مگر کب تک؟ پھر ایسا کیا کہ اوپر کا ایک کمرہ اپنے لئے رکھ کر باقی کا حصہ بھی کرائے پر اٹھا دیا۔ بڑھاپا دھیرے دھیرے قدم جما رہا تھا۔ پہلے بڑے سے سر کے تمام بال سفید ہوئے پھر جھڑنے لگے۔ عمر کے ساتھ گھومنا پھرنا بھی کم ہو گیا۔ کبھی کبھی دو تین دن تک اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا صرف میرے پتا جی کے۔ میں نے اکثر نوٹ کیا تھا کہ پتا جی بڑے میاں کی بہت عزت کرتے تھے۔ کبھی کبھی ان کا حال چال پوچھنے ان کے کمرے تک چلے جاتے تھے ورنہ آج تک کسی نے وہاں جھانکا تک نہیں۔ پتا جی ہمیشہ مجھے تاکید کرتے کہ اگر کہیں بڑے میاں سے ملاقات ہو جائے تو سلام ضرور کرنا، وہ بہت مہمان آدمی ہیں۔ میں دل ہی دل میں ہنستا کہ..... ''مہمان آدمی ایسے ہوتے ہیں کیا؟ چار فٹ لمبے، تین فٹ چوڑے!''۔ میں اس سمئے نو دس سال کا تھا مجھے پتا جی کی باتوں کی سمجھ نہیں تھی۔ بازار کا ماحول بڑے میاں کے لئے ساز گار نہیں تھا، ہر کوئی ان کا مذاق اڑاتا تھا۔ میں کیسے ان کو مہمان مان لیتا؟ ہاں وہ مجھے پہلوان ضرور لگتے تھے اور میں ان کے پاس جانے سے ڈرتا تھا۔ مگر اب کی بار جب میں کالج کی چھٹی میں گھر گیا تو بڑے میاں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ریلوے اسٹیشن پر دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے ایک ناٹے ضعیف شخص کو دیکھ کر لگا کہ میں نے اس بھکاری کو کہیں دیکھا ہے۔ جب وہ

میرے سامنے آیا تو میرا دل اُچھل کر رہ گیا..... بڑے میاں؟؟!

بھگوان کی یہ کیسی لیلا ہے کہ جن کے باپ دادا، پردادا پورے شہر پر حکومت کرتے تھے، جن کے جاہ وجلال کے سامنے اچھے اچھے سورما پانی پانی ہو جاتے تھے، جن کے سامنے سے کوئی بندہ جوتا چپل پہن کر گزر جاتا تو..... پکڑ کر سو جوتے اس کے سر پہ برسائے جاتے تھے۔ اُن خاندانی نوابوں کا آخری چشم و چراغ دوسروں کے سامنے دست سوال پھیلا رہا تھا۔ میں نے ان کے پھیلے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا تو وہ سہم گئے۔ مجھے پتا جی کی بات یاد آ گئی تو میں نے جھک کر ان کے پاؤں چھو لئے تو وہ سکتے میں آ گئے۔ ان کی سوالی نگاہوں کا میں نے جواب دیا..... ''بڑے میاں! آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں آپکے پڑوسی پنڈت گنگا رام جی کا بیٹا ہوں اشوک!''۔ بڑے میاں رو پڑے، بولے ''بیٹا، کیسے نہیں پہچانونگا؟ تم تو میرے سامنے پیدا ہوئے، پلے بڑھے ہو مگر میرے انجان بنے رہنے میں ہی تمہاری بھلائی ہے۔ میرے اپنے مجھے اس حال میں دیکھ کر انجان بن جاتے ہیں، تم تو پڑوسی ہو۔ کیا پتا میرا تم کو پہچان لینا..... تمہاری توہین کا سبب بن جائے؟''۔ میری پلکیں بھی بھیگ گئیں۔ میں نے زبردستی ان کو اپنے ساتھ آٹو رکشا میں بیٹھا لیا۔

پتا جی میرے ساتھ بڑے میاں کو دیکھ کر خوش ہو گئے اور مجھ سے کہا کہ تم نے بہت اچھا کیا جو ان کو اپنے ساتھ لے آئے۔ پچھلے کئی دنوں سے میں بہت پریشان تھا کہ پتا نہیں کہاں چلے گئے ہیں، کچھ بتایا بھی نہیں۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے بڑے میاں کی موجودگی میں پتا جی سے پوچھا کہ ان کا ایسا حال کیوں ہے؟ تو پتا جی نے بتایا کہ..... ''بڑے میاں کے ساتھ سب نے دھوکہ کیا۔ باپ نے پیدا کر کے دھوکہ دیا۔ ماں نے جوانی میں اکیلا چھوڑ کر دھوکہ دیا، مدھو بالا کے خرافاتی عشق نے دھوکہ دیا، مطلبی دوستوں کی صحبتوں نے دھوکہ دیا۔ پھر بھی سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا کہ بیس برسوں سے کرائے پر رہ رہے کرائے داروں نے بھی دھوکہ دیدیا۔ کرائے دینا تو دور، جس کمرے میں بڑے میاں رہتے تھے اسے بھی اپنے قبضہ میں کر لیا۔ بڑے میاں اب اللہ کے گھر میں (مسجد) میں پڑے رہتے ہیں اور اللہ کے بندوں سے لے کر کھاتے ہیں''۔ اتنے میں بڑے میاں اٹھے اور چلے گئے۔ میں روکنا چاہتا تھا مگر پتا جی نے

اشارے سے منع کیا، بولے ''انھیں جانے دو اشوک! وہ یہاں سے سیدھے مسجد جائیں گے اور جی بھر کے روئیں گے۔ خدا سے لڑینگے کہ میرے بھائی بہنوں کو تو لمبا تڑنگا پیدا کیا، میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا جو مجھے بونا کر دیا؟ کیوں بنایا مجھے ایسا کہ میرے ابا حضور نے کبھی مجھے اپنا بیٹا نہیں سمجھا۔ اور میری امی جان کی پاک دامن کو داغدار سمجھتے رہے۔ میری صحیح پرورش نہیں کی اور مجھے آج یہ دن دیکھنا پڑا۔ کیوں مدھوبالا کو اتنی حسین بنایا؟ کیوں میرے دل میں اس کا عشق بھر دیا؟ جو میں آج کہیں کا نہیں رہا۔'' دیکھنے اور سننے والے ہنستے رہینگے اور بڑے میاں خدا سے لڑتے رہیں گے اور روتے رہینگے۔ جب دل کے کالے کالے بادل برس جائیں گے تو مطلع صاف ہو جائیگا، پھر بڑے میاں وضو کریں گے، نماز پڑھینگے اور پھر وہی روزمرہ کے کام۔

کرائے دار بڑے اثر رسوخ والے ہو چکے تھے۔ روپئے کھلا پلا کر تحصیلدار کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور حویلی پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔ جب جب بھی بڑے میاں کرایہ مانگنے گئے تو جواب ملا..... ''بیس سال سے کرایہ دے رہے ہیں۔ حساب لگاؤ تو لاکھوں روپئے دے چکے ہیں تم کو، جتنی اس حویلی کی بھی قیمت نہیں ہوگی اس سے زیادہ دے چکے ہیں۔ اب کیسا کرایہ؟ تم کو ہم بیس ہزار اور دیتے ہیں لے لو اور یہ حویلی ہمارے نام کر دو ورنہ..... جاؤ! تم سے جو ہو سکتا ہے کر لو۔ ویسے بھی تمہارے مرنے کے بعد یہ حویلی ہمیں ہی ملنے والی ہے''۔ تب سے بڑے میاں نے وہاں جانا چھوڑ دیا ہے۔ نہ کرایہ لیا اور نہ بیس ہزار۔ بدلے میں ان سے کہا کہ ''ٹھیک ہے بھائی! جب میرے مرنے کے بعد یہ حویلی آپ لوگوں کی ہونے والی ہے تو میں کون ہوتا ہوں کرایہ مانگنے والا۔ دُعا کرو کہ اللہ جلدی مجھے اپنے پاس بلوا لے تا کہ تم لوگ سکون سے رہ سکو۔ اور رہی بیس ہزار کی بات تو..... وہ تم اپنے بچوں کی پڑھائی کے لئے رکھو میں کیا کرونگا اتنے سارے روپئے؟''۔ اب تم ہی بتاؤ بیٹا..... کیا بڑے میاں مہمان آدمی نہیں ہیں؟ میں نے پتاجی کی ہاں میں ہاں ملایا..... اور دل ہی دل میں ایک پلان بنا لیا جس پہ فوری عمل کرنے کی ضرورت تھی۔

دوسری صبح کی پہلی گاڑی سے میں سیدھے ہاسٹل پہنچا۔ اپنے دس پندرہ بدمعاش ٹائپ کے دوستوں کو بڑے میاں کی کہانی اور ان کے ساتھ ہوئے ناانصافی کی داستان سنائی تو سب کے سب بھڑک اُٹھے کہ ابھی چلو دیکھتے ہیں اس کرائے دار کے بچے کو۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ.....

''نہیں! ابھی نہیں جانا ہے۔ ہم رات کی ٹرین سے جائیں گے اور صبح وہاں پہنچ کر ڈرامہ کریں گے۔ پھر میں نے ان کو اپنا پلان سمجھایا۔ اور اسکے بعد ہم لوگ ساز وسامان کا بندوبست کرنے نکل پڑے۔ اتفاق سے کالج کا ڈرامائیک سکریٹری ہمارا دوست تھا اس نے ہماری مدد کی۔ ہم لوگ رات بارہ پچیس کی طوفان میل پکڑ کر صبح سویرے اپنے شہر پہنچ گئے۔ اسٹیشن کے قریب ایک سستے ہوٹل میں ٹھہرے اور چائے ناشتے سے فارغ ہو کر ڈریسنگ اور میک اپ کرنے لگے۔

ٹھیک آٹھ بجے کے قریب سب لوگ (مجھے چھوڑ کر)، پولس والے (اسپیشل برانچ) بن کر حویلی میں جا دھمکے۔ مُنّا نے جو انسپکٹر بنا تھا دروازے پر اتنی زور سے لات ماری کہ کواڑ کنڈی سمیت اکھڑ گیا۔ کرائے دار بیچارے حیران پریشان دوڑے ہوئے آئے کہ ماجرا کیا ہے؟ اور اپنے سامنے دس پندرہ پولس والوں کو دیکھ کر ان کی ہوا نکل گئی۔ مُنّا کی رعب دار آواز گونجی..... ''کون ہے بے اس حویلی کا مالک؟'' سُنیل جو کالج کے ڈرامے میں کامیڈی کرتا ہے اس نے تو کمال کر دیا۔ بیچ بیچ میں کواڑ جھروکوں کو ڈنڈے سے پیٹ دیتا اور کہتا..... ''انسپکٹر صاحب، زیادہ بات نہ کریں، موٹی آسامی ہے، پکڑ کر سیدھے دِلّی لے چلتے ہیں، پوری فیملی کو گرفتار کر لیتے ہیں''۔ بیچارے کرائے دار کو کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں ملا وہ لگا گھگیانے اور..... خود کو کرائے دار مان کر گھر خالی کرنے کو تیار ہو گیا۔ ٹھیک اسی وقت میں..... ایک شریف پڑوسی کا پڑھا لکھا لڑکا بن کر پہنچا اور کرائے دار کی طرف سے پوچھا..... ''انسپکٹر صاحب! آپ جو کر رہے ہیں وہ ٹھیک نہیں ہے، ظلم ہے۔ آپ کے پاس وارنٹ ہے؟ ہم پڑھے لکھے لوگ ہیں کوئی چور ڈاکو نہیں، وارنٹ ہے تو دکھایئے!''۔ مُنّا سچ مچ کا انسپکٹر بن گیا تھا..... تڑاک سے ایک جھانپڑ میرے کان کے نیچے جڑ دیا کہ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے اور بولا..... ''کل کا لونڈا مجھے قانون پڑھاتا ہے؟ ہم دِلّی سے یہاں خالی پیلی آ گئے ہیں کیا؟ وارنٹ دیکھے گا؟؟ لے دیکھ وارنٹ۔ اے ۱۱۴ نمبر اِس بہن..... (پولس والی گالی) کو بھی ہتھ کڑی لگا کہ پولس کے کام میں دخل اندازی کر رہا ہے''۔ میں نے خود سے تیار کیا ہوا وہ کاغذ مُنّا کے ہاتھ سے لے کر دیکھا اور جھوٹ موٹ سر ہلانے لگا اور پھر کرائے دار کے پاس پہنچ کر نیچی آواز میں بولا..... ''انکل جی! یہ تو سیدھے ہوم منسٹری سے آئے ہیں۔ آپ اور میں کیا اس وارنٹ کو یہاں کا ایس۔ پی بھی رَد نہیں کر سکتا کہ یہ

لوگ اس کو بھی گرفتار کر سکتے ہیں..... اسپیشل برانچ والے ہیں۔ یہ جو کہتے ہیں ابھی مان لیجئے بعد میں ہم کورٹ میں نپٹ لیں گے''۔ میری باتوں سے کرائے دار انکل کی رہی سہی ہمت بھی دم توڑ گئی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر رونے لگے کہ..... ''انسپکٹر صاحب، بیوی بچوں کو لے کر اتنی صبح کہاں جاؤنگا۔ مجھ پر رحم کریں، مجھے تھوڑا وقت دیجئے میں گھر خالی کر دیتا ہوں۔ تب تک آپ چاہیں تو ہمارے ہی گھر آرام کریں''۔ مُنّا جو انسپکٹر بنا تھا کرائے دار کے آنسو سے پگھلنے والا تھا کہ میں نے سنبھال لیا اور کہا..... ''ہاں انسپکٹر صاحب، زیادہ نہیں صرف دو گھنٹے کو وقت دے دیں تو ہم حویلی خالی کر دیں گے۔ تب تک آپ چاہیں تو آرام کریں یا پھر ایس۔ پی صاحب کے یہاں ہو آئیں''۔ میرے اشارے کو منّا سمجھ گیا اور بولا..... ''نہیں نہیں جب تک کام پورا نہیں ہو جاتا..... آرام حرام ہے۔ میں صرف ایک گھنٹے کا وقت دیتا ہوں، گھر خالی ہو جانا چاہئے ورنہ گھر کے اندر جو بھی ہوگا اس کو گھر کے ساتھ سیل کر دونگا۔ میں ذرا یہاں کے ایس۔ پی اور تحصیلدار کی خبر لے کر آتا ہوں..... بہت مال بنا رہے ہیں سالے، ان کی ہوا نکال کر آتا ہوں۔ تب تک یہاں کا معاملہ صاف ہو جانا چاہئے۔ چلو رے.....!''۔ یہ کہہ کر مُنّا بڑے اسٹائل سے مُڑا اور سامنے پڑی ہوئی ایک پلاسٹک کے چیئر کو اتنی زور کی لات ماری کے وہ اُڑ کر سیدھے ہمارے آنگن میں جا گری۔ میں دل ہی دل میں اسکی ایکٹنگ کی تعریف کرنے لگا کہ..... اگر ممبئی میں ہوتا تو جیکی شروف اور سُنیل شیٹی کی چھٹی کر دیتا۔

پلان کے مطابق وہ لوگ وہاں سے سیدھے ہوٹل پہنچے اور پھر وہاں سے ریلوے اسٹیشن جا کر نو بجے کی ٹرین میں سوار ہو گئے اور میں نے ادھر کرائے دار انکل کو ڈرا ڈرا کر گھر خالی کروالیا۔ وہ بیچ بیچ میں بولتے تھے کہ کسی کو فون کرتا ہوں شاید کام بن جائے مگر میں ان کو اور بھی ڈرا دیتا کہ..... ''انکل جی یہ غلطی بھول کر بھی نہ کریں، جو اسپیشل برانچ والے دہلی سے آتے ہیں وہ یہاں کے چھوٹے موٹے پولس والوں کو بھی پیٹ ڈالتے ہیں۔ اور ابھی تو وہ ایس۔ پی و تحصیلدار کی خبر لینے گئے ہیں، اگر انہوں نے آپ کا نام بول دیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ یہاں واپس آئیں آپ جلدی سے کہیں اور شفٹ ہو جائیں ورنہ..... تحصیلدار کا کوئی بھروسہ نہیں وہ خود کو بچانے کے لئے آپ کو کسی چکر میں پھنسا دیگا''۔

(c)جملہ حقوق بنام مصنف محفوظ

نام کتاب : آبیل مجھے مار

مصنف : منیر ارمان نسیمی

سال اشاعت : جنوری ۲۰۰۸ء

تعداد اشاعت : ۵۰۰ (پہلا اڈیشن)

قیمت : =/۱۰۰ روپے (بیرون ممالک سے: دس ڈالر)

کمپوزنگ/سرورق : ناواق ملٹی میڈیا، بھدرک، اڑیسہ

ناشر : روزن پبلی کیشن، سرکارنگر، بھدرک، اڑیسہ ۷۵۶۱۰۰

ملنے کے پتے:

☆ روزن پبلی کیشن، سرکارنگر، بھدرک-۷۵۶۱۰۰، اڑیسہ (انڈیا)

☆ مکتبہ کوہسار، بھیکن پور-۳، بھاگلپور-۸۱۲۰۰۱، بہار (انڈیا)

☆ انشا پبلی کیشن، ۲۵-بی، زکریا اسٹریٹ، کولکاتا-۷۰۰۰۷۳ (انڈیا)

☆ ماہنامہ ''رنگ و بو''، 18-8-3/A عیدی بازار، حیدرآباد-۵۰۰۰۲۳

☆ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، اردو بازار، دہلی-۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

☆ بک کارنر، موتیہاری، ایسٹ چمپارن، بہار (انڈیا)

☆ آزاد کتاب گھر، ساکچی بازار، جمشید پور، جھارکھنڈ (انڈیا)

☆ رنگ پبلی کیشنز، بیجوا، دھنباد-۸۲۸۱۲۱ جھارکھنڈ (انڈیا)

☆ ڈاکٹر خلیل صدیقی، ''اوصاف''، روڈ نمبر-۳، وینکٹیس نگر، لاتور (مہاراشٹر)

Name of the Book: AA BAIL MUJHE MAAR [Articles]
Name of the Author: Munir Armaan Nasimi
Price: Rs.100/- (For Indo-Pak), US$ 10 (For Abroad)

Address of the Author:
Post Box No-3, BHADRAK-756100 [ORISSA] INDIA
Mobile(s): 0091-99371-23856, 0091-99370-66492
E-mail:armaan28@yahoo.com, armaan28@gmail.com

میری دل دہلا دینے والی بات نے ان کو اور بھی پژمردہ کر دیا اور گھنٹہ بھر کے اندر جو کچھ بھی سمیٹ سکتے تھے سمیٹ کر وہ ایک لاری میں لاد کر بھاگے (بعد میں پتہ چلا کہ اسی شہر میں انہوں نے اپنی ذاتی کوٹھی بھی بنوا رکھی تھی مگر حویلی کو ہتھیانے کے چکر میں اپنی کوٹھی کو کرائے پر اٹھا کر خود کرائے دار بنے بیٹھے تھے اور بڑے میاں کے مرنے کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے)۔

گھنٹہ بیتا۔ دو گھنٹے بیتے ..... پورا دن بیت گیا مگر پولس والے لوٹ کر نہیں آئے۔ میرے پتا جی بیچارے میرے گال پر تھپڑ کے نشان کو اپنے دل پہ محسوس کر رہے تھے۔ میں گھر آیا تو وہ میرے اوپر برس پڑے کہ تجھے کیا ضرورت تھی دوسروں کے لئے پولس والوں کے منھ لگنے کی؟ تجھے نہیں معلوم کہ یہ پولس والے اپنے سگے باپ کے بھی نہیں ہوتے۔ کتنے زور سے مارا اس کمینے نے تم کو۔ کہیں لگی تو نہیں؟؟؟ میں نے کہا..... ''پتا جی! پولس والے میرے دوست تھے اور ایسے تھپڑ تو ہم ایک دوسرے کو پیار سے روز مارتے ہیں''۔ پتا جی کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں اور وہ مجھے عجیب سے انداز میں گھورنے لگے۔ وہ کچھ کچھ سمجھے اور بہت کچھ نہیں سمجھے۔ حیرت سے بولے ..... ''پولس والے اور تمہارے دوست؟ کیا مطلب؟؟ میں نے کہا..... ''میں آپ کو سب سمجھاتا ہوں مگر پہلے آپ جا کر بڑے میاں کو مسجد سے لے آئیں۔ اور اُن کو حویلی میں قبضہ جمانے کو کہیں''۔ پتا جی دوڑ کر بڑے میاں کو بلا لائے اور ان کے ساتھ چند اور لوگ بھی آ گئے۔ سب نے بڑے میاں کو مبارکباد دی۔ انھوں نے سب کو شکریہ ادا کیا اور خدا کے حضور سجدے میں گر گئے۔ دوپہر کا کھانا ہم سبھوں نے حویلی میں ہی کھایا۔ جب سب لوگ چلے گئے اور صرف میں، پتا جی اور بڑے میاں رہ گئے تو پتا جی خود کو اور روک نہیں پائے بولے ..... جلدی سے بتا، آخر ماجرا کیا ہے؟ پولس والے ابھی تک واپس کیوں نہیں آئے؟ اور وہ تمہارے دوست کیسے ہو گئے؟؟۔ میں نے کہا..... ''پتا جی، اب وہ لوگ واپس نہیں آئیں گے، وہ تو کب کے ممبئی پہنچ چکے ہونگے۔ وہ سب میرے کالج کے دوست اور نقلی پولس والے تھے۔ بڑے میاں کو انصاف دلوانے کے لئے میں نے یہ سب ناٹک کیا تھا۔ پھر سارا پلان ان کو بتایا تو پتا جی کچھ پل تک مجھے حیرت سے گھورتے رہے اور پھر ..... بدمعاش کہہ کر مجھے مارنے دوڑے تو میں لپک کے بڑے میاں کے پیچھے چھپ گیا۔ اور پہلی بار بڑے میاں کے چہرے پر ایک آسودہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

بڑے میاں نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگے اور بولے...... ''اے میرے پروردگار! مجھ گناہگار کو معاف کردے۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ تیرے گھر دیر ہے اندھیر نہیں! تو ہر فرعون کے لئے ایک موسیٰ ضرور بھیجتا ہے، ہمیں چاہئے کہ صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں''۔ پھر بڑے میاں اپنی حویلی میں رہنے لگے۔ دن مہینے اور سال میں بدلنے لگے۔ میں کالج ختم کرنے کے بعد نوکری پر لگ گیا تھا۔ ایک دن مجھے پتاجی کا خط ملا کہ بڑے میاں اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ تم کوشش کر کے ان کے چہلم میں ضرور آنا۔ تمہاری موجودگی میں بڑے میاں کی وصیت کھولی جائیگی، یہ ان کی شرط تھی۔ میں خط پڑھ کے اداس ہو گیا۔ چہلم کے دن گھر پہنچا۔ چہلم کے بعد ان کی وصیت کھولی گئی تو اس میں لکھا تھا...... ''میرا نہ کوئی سگا ہے اور نہ سوتیلا۔ میرے پڑوسی پنڈت جی اور ان کے بیٹے اشوک ہی میرے سب کچھ ہیں۔ انھوں نے میرا بہت خیال رکھا اور کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ اتنی بڑی دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔ میرے مرنے کے بعد میری اس حویلی کا مالک پنڈت گنگارام جی کا بیٹا اشوک ہوگا۔ اس حویلی میں جو کچھ بھی ہے سب اس کا ہوگا۔ وہ جس طرح بھی چاہے استعمال کرے!''۔

وصیت سن کر سب کی آنکھیں گیلی ہو گئیں اور مجھے پتاجی کی بات کا یقین ہو گیا کہ وہ مہان انسان تھے۔ میں نے ان کی حویلی کو غریب، یتیم اور نادار بچوں کا آشرم بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ اور آج جب میری کوشش کامیاب ہو گئی ہے اور ...... ''بڑے میاں بال آشرم'' کا اُدگھاٹن کرنے خود چیف منسٹر صاحب آرہے ہیں تو مجھے بڑے میاں بہت یاد آرہے ہیں۔ اگر ان کے مذہب میں مورتی پوجا کی اجازت ہوتی تو میں ضرور ان کی ایک مورتی بنوا کر آشرم کے بیچوں بیچ لگاتا اور ہر بچے سے وہی کہتا جو پتاجی مجھے بچپن میں کہا کرتے تھے کہ...... ''بیٹا! بڑے میاں کہیں مل جائیں تو انھیں سلام ضرور کرنا، وہ بہت مہان آدمی ہیں ......!!''

☆☆☆

ناک میں دَم ہے!

ہوا یوں کہ آنکھ اور کان کے درمیان جم کر لڑائی ہوگئی۔ اور چشمہ بیچارہ ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا سر کھجا رہا تھا۔ آنکھ کہہ رہی تھی کہ چشمہ میرا ہے کیونکہ وہ میرے لئے ہی اس گھر میں لایا گیا ہے مگر کان صاحب بھی کہاں چھوڑنے والے تھے انکی دلیل بھی دل کو لگتی تھی کہ چشمہ دن بھر ان سے لپٹا رہتا ہے، اسلئے چشمہ صرف انکا ہی ہے۔ ان دونوں کا جھگڑا جب حد سے آگے نکلنے لگا تو ناک بیگم نے زور سے گلا صاف کیا اور اپنی پاٹ دار دونوں منھ سے گویا ہوئیں'' بچو! آپس میں اس طرح نہ الجھو کہ لوگ تمہارا نام بدل کر ہندو پاک رکھ دیں۔ تم لوگوں کا جھگڑا بے بنیاد ہے۔ چشمہ نہ آنکھ کا ہے اور نہ کان کا، چشمہ صرف اور صرف میرا ہے کہ دن بھر اسکا سارا بوجھ میں ہی اُٹھاتی ہوں۔ میں ہوں تو چشمہ لگتا ہے اور آنکھ بی بی اس سے دنیا دیکھتی ہیں اور کان بیٹا اسکا ہاتھ پکڑے گھومتے رہتے ہیں۔ اسلئے بچپنا چھوڑو اور غور سے سنو کہ ناک بنا چشمہ ادھورا ہے''۔

قصہ مختصر، چشمہ چاہے کسی کا بھی ہو..... ناک بنا وہ ادھورا ہے۔ صرف چشمہ ہی کیوں ناک بنا تو جگ ادھورا ہے، ملک ادھورا ہے، قوم ادھوری ہے اور تو اور ہم اور آپ بھی ادھورے ہیں۔ ہر جگہ، ہر وقت، ہر ماحول میں ناک کا وجود مسلم ہے، چاہے آپ کا وجود ہو یا نہ ہو۔ صبح بستر سے اٹھتے ہی ہمیں اپنی ناک بچانی پڑتی ہے، پہلے ہم داتن سے دانت صاف کر لیتے تھے مگر جب سے گھر میں ٹیلی ویژن آیا ہے (وہ بھی ناک کی مہربانی سے، تفصیل قصہ پھر کبھی) ہماری نصف بہتر کی ناک ہمارے داتن سے کٹتی ہے، کہتی ہیں کیوں میری ناک کٹانے پر تلے ہو، پڑوسن روز پوچھتی ہیں 'کیا آپ نیا کلوز اپ (Close Up) کرتے ہیں؟' تو میں انکو کیا جواب دونگی؟؟ کل سے اگر تم نے داتن کو ہاتھ بھی لگایا تو میں اپنی اماں کو یہاں رہنے کے لئے بلالونگی۔ اور حضرات، یہ ایک ایسی دھمکی ہے جس سے ہم خواب میں بھی

لرز جاتے ہیں۔ان کی ناک کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے اللہ میاں نے بنانے کے بعد غصے میں ایک مُکا جڑ دیا ہو۔کبھی کبھی ناک اور گال کی حد ڈھونڈنے میں ہمیں کافی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ صبح اٹھتے ہی ہمیں اپنی اور پورے خاندان کی ناک بچانے کے لئے نیا کلوز آپ کرنا پڑتا ہے۔اور ہماری بیگم صاحبہ کا تو پوچھئے مت، صبح آنکھ کھلتے ہی، بستر سے سیدھے آئینے کے پاس جا کر اپنی ناک کو (جو کہ انکو ورثے میں اپنی امّی سے ملی ہے اور 'آدھی ناک' ہی کہلانی چاہیئے) رومال سے رگڑ رگڑ کر پونچھتی ہیں۔ایک دن ہم نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا کہ یاہو کی امّی (یاہو ہمارے اکلوتے بیٹے کا نام رکھا ہے ہماری بیگم نے۔ اس میں بھی ناک کی مہربانی ہے۔ کیونکہ ہماری پڑوسن مسز چمپی نے اپنے بیٹے کا نام ('ہوٹ میل' رکھا ہے) آپ روز صبح اپنی ناک کو رگڑتی کیوں ہیں، بھلا رگڑنے سے بھی کہیں ناک لمبی ہوتی ہے؟ تنک کر بولیں..... ''آپ کو کیا پتہ، رات کو سونے کے بعد اگر کوئی مکھی، مچھر یا کوئی کیڑا ہماری ناک پر بیٹھا ہوگا تو انفکشن ہونے کا ڈر ہے نا؟'' ہم نے دل میں سوچا کہ بیگم ایک بات آپ نے سچی کہی کہ رات کو سونے کے بعد کوئی یہ جرأت کر سکتا ہے ورنہ جاگتے میں تو آپ اپنی ناک پر مکھی تک بیٹھنے نہیں دیتیں۔اور رہی بات انفکشن کی تو..... اللہ جھوٹ نہ بلوائے انفکشن تو اُس بچارے کو ہو جائیگا جو آپ کی ناک شریف پہ بیٹھنے کی جرأت کریگا۔

آپ کو پتہ ہے صاحب، ہماری بیگم کی صحبت میں ہمارے نورِ نظر اور لختِ جگر بھی بڑے ناک کونسیئس (conscious) ہو گئے ہیں۔ابھی کل کی ہی بات ہے، جب ہم آفس سے پیدل گھر آ رہے تھے تو مسز چمپی نے ہمیں آنکھ کے اشارے سے بلایا اور ہم ڈرتے ڈرتے، ادھر ادھر دیکھ کر جب انکے پاس پہنچے تو بولیں..... آپ ذرا اپنے یاہو کو سنبھال لیں اگر دوبارہ اس نے ہماری بچی چیری کے ناک میں ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی تو بات پولس اسٹیشن تک پہنچ جائیگی اور آپ کی ناک کٹ جائیگی۔ہم گھبرا کر سرپٹ گھر میں گھسے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری بیگم بیٹے کو چُپ کروا رہی ہیں اور وہ ہے کہ آنکھ ناک دونوں بہائے چلا جا

رہا ہے۔ ہماری ناک میں بھی تھوڑی سی سرسراہٹ ہوئی، وہ جیسا بھی ہو ہے تو ہمارا ہی بیٹا اور آپ ہی بتائیے کہ اپنے بیٹے کی آنکھ میں آنسو دنیا کا کوئی باپ برداشت کر سکتا ہے کیا؟ بیٹی ہوتی تو بات الگ تھی کہ آنسو بہانا تو عورتوں کا پیدائشی حق ہے اور اس کام میں انکو مہارت بھی حاصل ہے۔ ہر طرح کے آنسوؤں کے تیر انکے ترکش میں ہوتے ہیں۔ مجال ہے جو کوئی ابنِ آدم بچ جائے۔

بہر حال، جب ہم نے بیگم سے دریافت کیا کہ آپ دونوں کورس میں کیوں رو رہے ہیں تو بولیں..... ہٹو جی، میں کہاں رو رہی ہوں، میں تو اپنے یا ہو بیٹے کی آنسو پونچھ رہی ہوں۔ آپ کو پتہ ہے آج اس چڑیل کی بچی چیرتی نے میرے بیٹے کی ناک کو گلگلا کہہ کر ہمارے پورے خاندان کی ناک کو گالی دی ہے۔ (حضرات ہماری بیگم کا مطلب ہے اُنکے پورے خاندان کو ورنہ اللہ جھوٹ نہ بلوائے..... لوگ ہمارے ابا اور دادا کے ناک کی مثال دیا کرتے ہیں اور میری امی حضور کہتی ہیں کہ میری ناک تیر کی طرح ہے)۔ اور میرے بہادر بیٹے نے اس نک چڑھی کی ناک کو کھینچ کر دو انچ لمبا کر دیا ہے۔ شام کو جب مسٹر گھوڑ پڑے آئینگے تو آپ جا کر ان سے شکایت کرنا کہ لڑکی ذات ہو کر میرے بیٹے کی ناک میں انگلی کرتی ہے۔ اگر آئندہ ایسا ہوا تو میں انکے پورے خاندان کی ناک پونچھ ڈالوں گی۔ انکو شاید پتہ نہیں ہے کہ میرے دادا مرحوم انگریزوں کے چوکیدار ہوا کرتے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ دونوں طرف ہے ناک برابر لگی ہوئی..... میرا مطلب ہے آگ برابر لگی ہوئی تو ایسے میں چپکے سے ناک بچا کر بازار چلا گیا۔

بھائیو! گھر تو گھر، بازار بھی ناک کے لئے محفوظ جگہ نہیں ہے۔ بات بات پہ لوگ ناک تک پہنچ جاتے ہیں۔ کچھ دکانداروں کی ناک اتنی حساس ہوتی ہے کہ وہ گاہک کو سونگھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ کون خریدنے آیا ہے اور کون صرف تاکنے اور جھانکنے۔ اور تو اور وہ آپ کو سونگھ کر یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ آپ کتنی حیثیت کے آدمی ہیں اور کیا خرید سکتے ہیں اور کیا نہیں۔ پچھلے دنوں ہمارے ساتھ ایک ایسا ہی حادثہ ہوا اور ہماری ناک کٹتے کٹتے بچی۔ ہوا یوں کہ گھر

کی گھٹن سے گھبرا کر ہم ایک دن ایک سوپر مارکیٹ میں گھس گئے۔ گھومتے رہے، رنگین نظاروں سے نظر سینکتے رہے اور طرح طرح کی دیسی بدیسی خوشبوؤں سے اپنی ناک کو لطف دیتے رہے۔ ہمیں پتہ نہیں تھا کہ ہمارے ناک کے سیدھ میں ایک آدمی کھڑا ہمارے اوپر نظر رکھ رہا تھا (یہ تو ہمیں بہت بعد میں پتہ چلا کہ ایسے بڑے اسٹورس میں سیکورٹی کے لوگ گاہکوں کے ساتھ گاہک بن کر ان کے اوپر نظر رکھتے ہیں)۔ وہ ہمارے قریب آیا اور بولا..... کہیئے صاحب، کیا خریدنگے؟ کچھ لینا بھی ہے یا صرف ہر کاونٹر پہ ناک گُسیڑھ رہے ہیں؟ اسکی بات سن کر ہماری ناک میں مرچی لگ گئی۔ مگر ہم نے اسکی ڈیل ڈول کو دیکھ کر اپنے غصّے کو چاپ لیا اور پوچھا..... کیوں بھائی، ہم کچھ خریدیں یا نہیں، اس سے آپ کو بدہضمی کیوں ہو رہی ہے؟ وہ بڑے اطمنان سے بولا..... بات یہ ہے کہ میں اس اسٹور کی ناک ہوں، مطلب سیکورٹی افسر ہوں۔ آپ جیسے مڈل کلاس لوگوں کو سونگھ کر پہچان لیتا ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ آپ لوگ اپنی ناک اونچی کرنے کے لئے مطلب جھوٹی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے بڑے بڑے ہائی اسٹانڈرڈ سوپر اسٹورس میں گھس تو جاتے ہو مگر لینا دینا کچھ نہیں، صرف دیکھنے کے لئے۔ ہوسکتا ہے کہ اسٹورس میں گھستے یا نکلتے وقت کسی پڑوسی یا دوست کی نظر آپ پر پڑ جائے تو آپ کی ناک کا سائز بڑھ جائے مطلب آپ اس پہ رعب ڈال سکیں کہ دیکھو ہم اتنے بڑے سوپر اسٹورس سے شاپنگ کرتے ہیں۔ ہے نا صاحب؟!

اُس کی کڑوی کسیلی سچائی سے ہماری ناک کے اوپر پسینہ آ گیا۔ ہم نے اپنی شرمندگی کو پونچھ کر جھوٹی مسکراہٹ کا سہارا لیا اور اپنی خاندانی ناک بچاتے ہوئے وہاں سے چلے آئے۔ اور دل میں ٹھان لیا کہ آج کے بعد دوبارہ کبھی ایسے اسٹورس پر نہیں جائینگے جہاں اتنا سچا سیکورٹی افسر کام کرتا ہو۔ مگر صاحب! ہم کریں تو کیا کریں؟ آجکل بازار میں بھی گھر جیسا ماحول ہو گیا ہے، اور گھر میں بازار نہ جانے کہاں سے گھس آتا ہے۔ ہمارے ایک دوست کی دوکان ہے 'اللہ والا جنرل اسٹورس'۔ ہم کئی بار وہاں بھی بیٹھے، ہماری طرح کچھ اور لوگ بھی وہاں بیٹھتے ہیں وقت گزاری کے لئے مگر..... وقت گزاری کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ

بازار میں بیٹھ کر اپنے رشتے داروں کی، پڑوسیوں کی ناک کے بال کھینچیں؟ حاجی چراغ دین صاحب کی صاحبزادی کس کے ساتھ بھاگ گئی۔ مولوی اصلاح الدین صاحب کا بڑا بیٹا کس غیر مسلم نرس کے چکر میں ہے۔ بی خیراتن کو اسکی بہو نے کل رات لات مار کر اسپتال پہنچا دیا۔ بینک منیجر چترجی کی بیٹی کیسے اور کہاں پوسٹ مین چھوکرے کے ساتھ گتھیں لڑا رہی تھی وغیرہ وغیرہ۔ ہم کو ان کی باتوں سے غصہ تو بہت آتا تھا اور ہم سوچتے تھے کہ ہماری غیر موجودگی میں یہ لوگ ہماری بھی ناک کھینچتے ہونگے۔ ایک دن ہم نے ان لوگوں کو سمجھانا چاہا اور بولے..... بھائیو! کیا ہم کوئی اور بات نہیں کر سکتے؟ یہ عورتوں کی جبلت ہم میں کہاں سے در آئی؟ دوسرے کی چغلی کرنا، پڑوسیوں کے سفید دامنوں کو اپنی مسالے دار باتوں سے داغدار کرنا کہاں کی شرافت ہے؟ حاجی صاحب کی بیٹی بھاگ گئی یا مولوی صاحب کا بیٹا کسی نرس کے پیچھے پڑا ہے تو اس میں حاجی صاحب اور مولوی صاحب کی کیا غلطی ہے؟ کیا انہوں نے اپنی اپنی اولاد سے کہا ہے کہ جاؤ دوسروں کی بہو بیٹیوں کو چھیڑ کر ہماری ناک کٹوا آؤ؟ اللہ ہر کسی کو اسکے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دیگا تو پھر اولاد کی عمل کی سزا آپ لوگ حاجی صاحب یا مولوی صاحب کی ناک کو کیوں دے رہے ہیں؟؟ اگر کل کو، خدانہ کرے، ہماری اور آپ کی اولاد سے بھی ایسی غلطی ہو جائے اور بقول آپ کے ہماری ناک کٹ جائے تو کیا آپ گھر سے نکلنا بند کر دیں گے؟ یا اپنی کٹی ناک کے ساتھ بازار آئیں گے؟؟

ہم نے دیکھا کہ ہماری باتوں کا اثر ہوا ہے۔ زندگی میں پہلی بار ہمیں ہماری اپنی ناک اونچی ہوتی ہوئی لگی۔ ہماری باتوں کو سن کر یادو جی بولے..... ''آپ بلکل صحیح کہہ رہے ہیں، آپ کی ناک میں..... میرا مطلب ہے بات میں دَم ہے کہ..... ہمیں اپنی ناک کو اونچا رکھنے کے لئے دوسروں کی ناک نہیں کاٹنی چاہیئے۔ کیا پتہ قدرت کی قینچی کب ہماری ناک پہ ہی چل جائے''۔

☆☆☆

نشانِ مردانگی

اُس دن برسوں بعد اچانک دونوں دوستوں کی ملاقات مارکیٹ میں ہوگئی۔ رمضانی کلین شیو تھا تو میاں شبراتی کی مونچھیں اتنی گھنی اور لمبی تھیں کہ نیچے کے لب کو چھو رہی تھیں اور اوپر کا ہونٹ برقعے میں ڈھکی عورت کی طرح چھٹ پٹا رہا تھا۔ حیرت سے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے کہ یہ اُلٹ پھیر کیسے ہوگیا؟ جو شبراتی مونچھ کے نام سے ناک اتنا سکوڑ لیتا تھا کہ لگتا تھا جیسے دونوں آنکھوں کے درمیان ہی ناک بنائی گئی ہے، وہی شبراتی آج مونچھ سے ڈھکا ہوا ہے۔ یہی بات شبراتی بھی سوچ رہا تھا کہ کالج کے دنوں میں جو رمضو (رمضانی کو ہم سب پیار سے رمضو ہی کہتے تھے) اپنی مونچھ کو سرسوں کا تیل پلا پلا کر رکھتا تھا اور کہتا تھا کہ..... مونچھ مردانگی کا جھنڈا ہے اور مونچھ نہ ہو تو عورت و مرد کے درمیان فرق کرنا مشکل ہے، وہی رمضو آج مونچھ سے بے نیاز..... کلین شیو بالکل کسی عمر دراز فلمی ہیروئن کی طرح لگ رہا تھا۔ علیک سلیک کے بعد دونوں نے اپنی اپنی حیرت کا اظہار ایک دوسرے سے کر ہی دیا۔ رمضانی نے پوچھا ''بھائی شبراتی، تم نے مونچھیں کب سے اُگالی ہیں؟ تم تو مونچھ کے نام سے گھبراتے تھے؟''۔ شبراتی نے بڑے افسوس سے کہا ''کیا کروں بھائی رمضو! تمہاری بھابی کے خاندان میں کوئی بھی بنا مونچھ کا نہیں ہے۔ سب کی مونچھ ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ جب میری شادی ہوئی تو سہاگ رات میں ہی تمہاری بھابی نے مجھ سے وعدہ لیا کہ آج کے بعد میں اپنی مونچھ کو ہاتھ نہیں لگاؤنگا کیونکہ آج سے میں اُنکے خاندان کا فرد ہوگیا ہوں۔ اگر میں نے اپنی مونچھ صاف کی تو وہ میرا پتا صاف کردیگی''۔ اب مرتا کیا نہ کرتا مجھے مونچھ اُگانی پڑی، صرف اُگانی ہی نہیں پڑی بلکہ اپنا خون دل پلا کر بڑھانی بھی پڑی۔ تم بتاؤ میاں..... تم نے کیوں اپنی مردانگی کے جھنڈے کو اُتار دیا؟ کیا تم نے..... اللہ نہ کرے، خود کو تیسری صنف میں شامل کرلیا ہے؟''۔ رمضانی کے تن بدن میں آگ لگ گئی جسے اُس نے ہنسی

کے بادل سے ڈھانک لیا اور بولا'' بھائی شبراتی! میں تمہاری طرح گھر جمائی تو نہیں ہوں جو اپنی بیگم کی ہر جائز اور ناجائز خواہش کو پورا کروں ورنہ بھوکا رہوں۔ میں مرد ہوں، عورت کو کنٹرول کرنے کا فن جانتا ہوں۔ جب میں نے دیکھا کہ تمہاری بھابی جان ذرا ذرا سی بات پر بگڑ کر میری مونچھ کو لگام کی طرح کھینچ لیتی ہے تو بہت سوچنے کے بعد ایک دن بروز جمعہ سیلون میں جا کر اُسے شہید کر آیا۔ میرا یقین کرو..... اتنا دُکھ تو اپنے حاجی خلیل کو بقرعید میں بوڑھے بکرے کی قربانی دیکر بھی نہیں ہوا ہوگا..... جتنا دُکھ مجھے ہوا تھا۔ پر کیا کرتا عورت کے ہاتھ سے ہتھیار چھین لینا بہت ضروری تھا ورنہ کیا پتہ کسی محفل میں یا مجلس میں.....؟؟!''

کبھی کبھی سوچتا ہوں..... اللہ نے مردوں کو مونچھیں کیوں دی ہیں؟ کیا بنا مونچھوں کے مرد..... مرد نہیں ہوسکتا تھا؟؟ ایک دن میرے دل نے مجھے جواب دیا..... '' تم اتنی سی بات نہیں سمجھے، بے وقوف کہیں کے۔ اللہ خالق و مالک ہے۔ رزّاق بھی ہے اور مسب الاسباب بھی۔ ہر جاندار کو روزی دیتا ہے۔ خود سامنے آ کر روزی تو نہیں دیگا نہ؟ اُسکے لئے وہ روزی کے اسباب پیدا کر دیتا ہے۔ ذرا سوچو اگر ہماری مونچھیں نہیں ہوتیں تو بے چارے نائی کیا کرتے؟ صرف سر کے بال کاٹ کر انکے گھر میں ہفتے میں کتنی بار چولہا جلتا؟ ہم تو مہینے دو مہینے میں ایک بار بال کٹواتے ہیں (کئی ایک تو ایسے بھی ہیں جو سالانہ کٹاتے ہیں اور کوئی کوئی ایسے بھی ہیں جو سہ ماہی!) ایسے میں بیچارہ نائی اور اسکا پریوار کیسے چلتا؟ اسکے بچے کیا کھاتے، کیا پہنتے؟؟ خدا نے اس لئے ہمیں مونچھیں دی ہیں کہ..... ہر دو تین دن میں وہ دوبارہ اُگ آئیں گی تو ہم کو مجبوراً نائی کی دکان پہ جانا پڑیگا..... تو اُسکا چولہا جلے گا''۔ میں نے دل سے اُلٹا سوال کیا کہ..... '' اور جو لوگ نائی کی دکان پہ نہیں جاتے، خود اپنے ہاتھوں سے، اپنے گھر میں صاف کر لیتے ہیں، اُس کا کیا؟''۔ تو میرے دل نے جھٹ سے کہا..... '' مجھے پتہ تھا تم یہ سوال ضرور کرو گے مگر تم شاید یہ نہیں جانتے کہ جو لوگ گھر میں مونڈتے ہیں وہ اور بھی مہان ہوتے ہیں۔ انکے ذریعہ کئی لوگوں کے گھر میں چولہا ہی نہیں بلکہ گھر کے ایئر کنڈیشنر، فریج، کار وغیرہ بھی چلتے ہیں۔ جیسے گھر میں مونچھیں صاف کرنے کے لئے آپ کو بلیڈ خریدنی ہوتی ہے، صابن

یا کریم خریدنی ہوتی ہے، برش اور پھٹکری خریدنی ہوتی ہے..... اور تو اور ڈیٹول اور کبھی کبھی بینڈ یجز بھی خریدنی پڑتی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ، گھر میں صاف کرنے سے کتنے سارے لوگوں کا بھلا ہوتا ہے۔ ہے نا؟!''

بہر حال، یہ بات ثابت ہے کہ ہمارے دادا، پردادا اور انکے دادا پردادا کے دور میں کوئی بھی مرد اپنی مونچھیں صاف کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ ہمارے پردادا سردار خوشبخت خان کے بڑے ابا بختاور خان جلالی نے اپنی اکلوتے اولاد کو ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ولایت بھیجا۔ وہ صاحب وہاں جا کے اپنی خاندانی نشانی .....تلوار کٹ مونچھیں کٹا آئے۔ سُنا ہے کہ پانچ سال کے بعد گھر لوٹے اپنے اکلوتے بیٹے کی صورت کو ماں ترستی رہ گئی مگر..... انہیں دیکھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ نوکروں سے اپنے بیٹے کو بندھوا کر بختاور جلالی نے اپنے مہمان خانے میں .....تب تک نظر بند رکھا، جب تک کہ انکی مونچھیں حسب سابق نہیں اُگ آئیں۔ ذرا اُس باپ کے جاہ وجلال اور اُس ماں کی تڑپ کا اندازہ کیجئے جو.....سوگز کی دوری پہ رہنے والے اپنے اکلوتے بیٹے سے صرف اس لئے نہیں مل پائیں کہ اسکی مونچھیں نہیں تھیں۔ ایک ہم ہیں کہ.....اپنی امی سے پیسے لے لے کر مونچھ کٹوا آتے ہیں، کیونکہ امی کو ہم کلین شیو ہی اچھے لگتے ہیں، جیسے ان کو عامر خان اچھا لگتا ہے مگر انل کپور کو دیکھتے ہی چینل بدل دیتی ہیں!

ابھی چار پانچ دن پہلے ہم ''ٹائمس آف انڈیا'' میں ایک خبر پڑھ کے حیران رہ گئے کہ ایک دیہاتی دُلہن نے سات پھیرے لینے سے صرف اس لئے انکار کر دیا کہ اسکے ہونے والے پتی دیو کی مونچھیں نہیں تھیں۔ گھر والوں نے دلہن کو بہت سمجھایا کہ..... بیٹی، شادی کر لو۔ مونچھیں نہیں ہیں تو کیا ہوا، ہفتے بھر میں آ جائیں گی۔ چلتی کا نام گاڑی اور بڑھتی کا نام داڑھی.....اپنے گھر کی کھیتی ہے۔ جب چاہو کاٹ دو، جب جی میں آئے اُگا لو۔ مگر وہ سر پھری لڑکی اپنی ضد پہ اڑی رہی اور بے چارے دولہا میاں کو خالی ہاتھ واپس ہونا پڑا۔ پتہ نہیں اسکے بعد.....دولہے راجا اپنی مونچھیں بڑھا کے دوبارہ شادی کرنے آئے یا.....؟

ماما جمی کے نام .....

ایک غیرت مند دُلہن وہ ہے اور ایک ہیں ہماری فیشن ایبل، ہائی ٹیک بیگم۔ جو گرگٹ کی طرح ہر مہینے پندرہ دنوں میں ہمیں تگنی کا ناچ نچاتی ہیں۔ ایسی ناچ تو انترا مالی نے بھی ابھیشیک کو نہیں نچایا ہوگا۔ کبھی مُوڈ میں آتا ہے تو کہتی ہیں..... اجی سُنتے ہو، دیکھو اجے دیوگن کتنا پیارا لگ رہا ہے گجرال کٹ داڑھی مونچھ میں۔ تم بھی رکھو نہ پلیز۔ خالہ امی کی قسم بہت سیکسی لگو گے (خالہ امی سے مطلب ہماری امی جو انکی ماں کی خالہ زاد بہن لگتی ہیں!)۔ اب یہ ہم تو نہیں جانتے کہ ہم بغیر داڑھی مونچھ کے سیکسی لگتے ہیں یا..... داڑھی مونچھ سمیت۔ کیونکہ دونوں ہی حالت کی ذمے دار ہماری بیگم ہوتی ہیں۔ وہ جو کہتی ہیں ہم کر جاتے ہیں کیونکہ جب وہ سیکسی ہونٹوں سے کہتی ہیں کہ تم بڑے سیکسی لگو گے تو..... قسم جوانی کی، ہم چوالیس سال میں بھی اپنے اندر ایک نوجوان کو..... کسمساتے ہوئے پاتے ہیں۔ یہ راز تو ہمیں ابھی چند دن پہلے ہی معلوم ہوا کہ ہماری بیگم ہر ہفتے اپنی کٹی پارٹی میں..... کسی سہیلی کو پھنسا لیتی ہیں اور اُس سے شرط لگا لیتی ہیں کہ..... ''اگر تم اپنے پتی کی مونچھ کٹوا کے دکھا دو تو میں تمہیں پانچ سو روپیہ دونگی۔ (اگر سہیلی کے پتی کی مونچھ ہوئی تو ورنہ شرط اُلٹا دیتی ہیں کہ اگر تم اپنے پتی کو مونچھ رکھنے پر مجبور کر کے دکھا دو تو) اور اگر تم ایسا نہیں کر سکیں تو تم مجھے پانچ سو دوگی''۔ اور ہر بار ہماری بیگم جیت کے ہی واپس آتی ہیں کیونکہ ہم ٹھہرے پتنی ورتا پتی..... انکی بات مان کر کبھی مونچھ چھوڑ دیتے ہیں تو کبھی کاٹ دیتے ہیں۔ ہمیں یہ راز اُس سہیلی کے پتی نے بتایا جو اس بار بالکل ہارنے کے موڈ میں نہیں تھی اور تین دن سے بھوکی رہ کر اپنے بے چارے پتی پر دباؤ ڈال رہی تھی کہ آپ مونچھیں کاٹ کر آؤ تبھی بھوک ہڑتال توڑونگی۔ اب کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟ ہماری مونچھ نہیں ہوئی تاش کی پتی ہوگئی، جس پہ ہماری بیگم بڑے ٹھاٹھ سے جُوا کھیل آتی ہیں!

سُنا ہے، آزادی سے پہلے ہمارے ملک میں پولس کی نوکری کسی صفاچٹ کو نہیں ملتی تھی۔ پولس میں وہی جاتا تھا جس کی مونچھیں تگڑی ہوتی تھیں۔ اسکے پیچھے کیا فلسفہ تھا پتہ نہیں؟ کیونکہ تگڑی مونچھیں تو..... چور، ڈاکو اور اُٹھائی گیر بھی رکھتے تھے تاکہ شریف لوگوں کو ڈرا

…ں۔ تو کیا ہمارے پولس والے بھی شریف … ڈرانے کے لئے؟ یا پھر چوروں اور ڈاکوؤں سے مقابلۃً مونچھ کیا کرتے تھے؟ اب یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون کس کو ڈرا تا...... ج بھی … ایک خطے میں مونچھ کو مردوں کی شان سمجھ… ہے۔ وہاں کے فلمی ہیرو بھی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں، طرح طرح کی مونچھیں رکھتے ہیں۔ کس… مونچھ اتنی نوکیلی کہ ضرورت پڑے تو اُس سے دانت میں اٹکے گوشت بھی نکالے جاسکتے ہیں اور کسی کی مونچھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ بکری کی دُم ہے۔ ہمارے اُستاذی مُلا قمرالدین صاحب بڑے مذہبی قسم … مان تھے، اللہ انھیں کر… کروٹ جنت ن… کرے۔ زندگی بھر ایسی مونچھیں رکھ کر …… جھگڑ … تو مونچھیں … ہیں اور بالکل قریب آ… تو پتا چلتا ہے کہ ہیں۔ اتنی باریک مونچھیں کہ نائی کے ہاتھ کی صفائی پر دا… عش کر اُٹھے۔ سُنا ہے مُلا جی نے کسی ک… یہ پڑھ… بڑھاؤ!''۔

☆☆☆

منیر ارمان نسیمی کے شوخ و س… تحریروں کا

دوسرا …

چلو فتویٰ لگائیں !!

…ب ہے]

پیش …

روزن پبلی کیشن، … بھدرک-۷۵۶۱۰۰ (اڑیسہ) انڈیا

مکھی چوس

شک اور حسد کی طرح کنجوسی بھی ایک ایسی بیماری ہے جس کا علاج تھا، ہے اور نہ مستقبل قریب میں ہونے کی امید ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بیماری باپ، دادا سے وراثت میں ملنے کی وجہ سے لاعلاج ہو۔ کنجوس..... مرتے دم تک کنجوس ہی رہتا ہے۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ مرنے کے بعد بھی اپنے کفن دفن، فاتحہ اور، چہلم میں بھی کنجوسی کر جاتا مگر ہائے افسوس کہ..... مُردے بولا نہیں کرتے!

یوں تو آئے دن ہمیں اور آپ کو طرح طرح کے کنجوسوں سے پالا پڑتا ہے مگر میرا چھوٹا سا تجربہ یہ کہتا ہے کہ دنیا میں صرف دو طرح کے کنجوس ہوتے ہیں۔ ایک مہذب کنجوس..... دوسرا بے شرم کنجوس۔ ہمارے ہی آفس میں ایک صاحب ہیں شری ہریش چندر گھوش جی۔ بڑے ہی ملنسار اور باتونی ٹائپ کے آدمی ہیں۔ ہمیشہ ایک دلکش مسکراہٹ انکے ہونٹوں پہ سجی رہتی ہے۔ جب میں نے پہلی بار آفس جوائن کیا تو سب سے پہلے جو بندہ بڑے خلوص سے آکر ملا وہ یہی صاحب تھے۔ گھوش بابو میرا ہاتھ پکڑ کر کینٹین تک لے گئے اور ایک ہی گھنٹے میں میرے دل میں گھر کر گئے۔ میں نے سوچا..... چلو اچھا ہوا، پہلے ہی دن ایک مخلص دوست مل گیا۔ مگر دھیرے دھیرے مجھے اندازہ ہونے لگا کہ آفس کے دوسرے کلیگس جو کہتے تھے وہ صحیح تھا اور میں غلط۔ ان لوگوں نے مجھے کتنا سمجھایا تھا کہ..... ''یہ شریف اور سیدھا سادا دکھنے والا انسان بڑا گھاگ ہے اور اتنا شاطر کہ کنجوسی بھی کرے اور سامنے والے کو اسکا احساس بھی نہ ہونے دے''۔ مگر میں اپنے کلیگس کی باتوں کو جلن، حسد وغیرہ سمجھ کر ہمیشہ نظر انداز کر دیا کرتا تھا۔ جب وہ لوگ گھوش بابو کو ''مکھی چوس'' کہہ کر چڑھاتے تھے تو مجھے بہت برا لگتا تھا۔ مگر اب احساس ہو رہا ہے کہ گھوش بابو جیسے شریف، شاطر اور مہذب کنجوس کو اگر.....

مکھی چوس کے بجائے مچھر چوس یا کھٹمل چوس بھی کہا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

کھانے پینے کے معاملے میں گھوش بابو بہت تیز ہیں۔مگر جب بات خود کے خرچ کی ہوتی ہے تو بڑی چالاکی سے مچھلی کی طرح پھسل جاتے ہیں۔مثال کے طور پر..... ہمارے آفس میں دن میں دو بار چائے دی جاتی ہے۔تو ہم کلیگ لوگوں نے ایک روٹین بنالیا ہے کہ ٹی ٹائم میں سب کلیگ کینٹین چلے جاتے ہیں اور ہم میں سے کوئی ایک سب کے لئے..... بسکٹ، کیک یا پیسٹری کا آرڈر دیتا ہے۔کوئی زبردستی نہیں ہے، وہ اپنی پسند اور جیب کی حالت دیکھ کر سب کو کھلاتا ہے۔ پھر ہم سب چائے پی کر اپنے اپنے کام میں لگ جاتے ہیں۔ دوسرے دن کوئی اور.....تیسرے دن کسی اور کی باری۔اسی طرح چلتا رہتا ہے اور پہلے والے کا نمبر دوبارہ آتے آتے ایک مہینہ لگ جاتا ہے۔یعنی کہ مہینے میں ایک بار سب کو کھلانا پڑتا ہے۔مگر جب ہمارے گھوش بابو کا نمبر آتا ہے تو آپ جانتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں؟ ٹی ٹائم سے دس پندرہ منٹ پہلے اپنے کیبن سے نکل جاتے ہیں۔ پھر جب ہم سب کینٹین پہنچتے ہیں تو وہاں گھوش بابو اپنے دونوں ہاتھوں میں ٹرے پکڑے ہماری سواگت کے لئے کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔وہی شوخ اور شریر مسکراہٹ ہونٹوں پہ سجائے۔ان کے ہاتھوں کی ٹرے میں بھنی ہوئی مونگ پھلی ہوتی ہیں۔جو وہ ہم سب کے سامنے پروس دیتے ہیں اور کہتے ہیں.....'' روز روز کیک اور پیسٹری کھا کھا کر من اوب گیا ہے۔میں نے سوچا کہ آج مونگ پھلی کھاتے ہیں وہ بھی نمک مرچ لگا لے.....مزہ آجائے گا۔ڈاکٹر لوگ بھی کہتے ہیں کہ مونگ پھلی کھانے سے دماغ صحت مند رہتا ہے''۔آدھا کیلو مونگ پھلی کو چھیلتے، کھاتے کب پندرہ منٹ نکل جاتے ہیں پتہ نہیں چلتا۔ پھر جیسے ہی بیل بجتی ہے ہم لوگ اپنی اپنی چائے حلق میں انڈیل کر.....اپنے اپنے کیبن کو دوڑتے ہیں اور گھوش بابو..... بچے ہوئے مونگ پھلی کو جلدی جلدی کاغذ کے پیکٹ میں بھر کے اپنے بیگ میں ٹھونس لیتے ہیں کہ گھر میں کام آئے گا۔دیکھا آپ نے، بیس روپئے میں کلیگ بھی خوش اور شام کو بیوی بھی خوش کہ پتی دیو میرے لئے مونگ پھلی لائے ہیں جو جلد کی رنگت نکھارنے میں مدد کرتی ہے۔

گھوش بابو اور انکی کنجوسی کے بارے میں کئی دلچسپ قصے مجھے میرے کلیگ سلمان بٹ نے سنائے۔ کچھ ایک تو اتنے حیرت انگیز تھے کہ یقین کی باؤنڈری لائن سے باہر جا کر گرے۔ مگر سوچتا ہوں کہ کچھ تو ہوگا ورنہ بنا آگ کے دھواں کہاں اٹھتا ہے۔ سلمان نے بتایا کہ..... اگر پڑوسی کے گھر مچھلی تلی جارہی ہو تو ہمارے گھوش بابو اپنے گھر میں روٹی لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور آنکھ بند کر کے ناک کے سارے دروازے کھول دیتے ہیں۔ لمبی اور گہری سانسیں کھینچتے رہتے ہیں اور اپنے منہ میں روٹی ٹھونستے رہتے ہیں۔ اور اسی طرح بنا سالن کے روٹی کھا لیتے ہیں اوپر سے مچھلی کھانے کا احساس ان کی روح تک کو سرشار کر جاتا ہے۔ نہ ہلدی لگا نہ چونا مگر رنگ آیا چوکھا!

میں نے کئی بار سوچا کہ کسی سنڈے کو ان کے گھر ہو آؤں اور اس مہان عورت کے درشن کر آؤں جو گھوش بابو کی شریک حیات ہے۔ ذرا دیکھوں تو سہی کہ وہ بیچاری، قسمت کی ماری کیسے ان کو جھیل رہی ہے؟۔ یہی سوچ کر میں پچھلے کئی مہینے سے ہر سنڈے کو بنا بتائے ان کے گھر تک پہنچ جاتا ہوں مگر ہائے رے میری قسمت! ہر بار ان کے دروازے پر لگا علی گڑھ کا تالا میرا منہ چڑھا دیتا ہے۔ پھر مجھے شک ہوا کہ کہیں کنجوس گھوش بابو نے مجھے غلط پتہ تو نہیں دیدیا؟ میں ان سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ہوشیار ہو جائینگے۔ اس لئے پچھلے سنڈے کو جب میں نے ان کا کوارٹر بند دیکھا تو پڑوس کے کوارٹر کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ ایک منحنی سا چہرہ دونوں کواڑ کے درمیان سے نکلا اور بم کی طرح پھٹ پڑا ''کیا ہے؟''۔ میں سہم گیا اور پوچھا..... ''گھوش بابو کا کوارٹر کہاں ہے؟''۔ ''ساتھ والا کوارٹر جو بند پڑا ہے وہی انکا ہے مگر وہ سنڈے کو گھر میں نہیں رہتے، اپنی ہیروین کو لے کر گھومنے نکل جاتے ہیں''۔ اتنا کہہ کر وہ شخص پلٹا اور دروازہ دھڑام سے بند۔ اس وقت مجھے اپنا گاؤں بہت یاد آیا، جہاں بھولے بھٹکے اجنبی کو بھی اتنی عزت دی جاتی ہے کہ جیسے وہ کوئی غیر نہیں اپنا سگا سمبندھی ہے۔ اور ایک یہ شہر ہے.....!

اُس دن بھی سنڈے تھا اور میں نے سنیچر کی رات سے ہی سوچ لیا تھا کہ کل کا

سنڈے بیکار نہیں جانے دونگا۔ صبح آٹھ بجے تک گھوش بابو کے گھر پہنچ جاؤنگا اور پکڑ لونگا۔ آخر اتنی صبح صبح کسی کے یہاں تھوڑے ہی نکل جائیں گے؟ یہی سب سوچ کر میں نے سنیچر کی رات کا لیٹ نائٹ فلم بھی نہیں دیکھا۔ دس بجے کا سماچار سن کر..... گھڑی میں صبح چھ بجے کا الارم دیکر سو گیا۔ جب مسلسل گھنٹی کی آواز سے میری نیند کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ گھڑی خاموش ہے مگر کالنگ بیل بج رہی ہے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا کہ کوئی مصیبت کا مارا ہوگا جو اتنی صبح صبح اور اتنی بے صبری سے بیل بجا رہا ہے۔ میں جلدی میں بنا بنیان پہنے..... برمودا میں ہی جا کر دروازہ کھول دیا۔ ''اوئی ما..... اے کی بے پار'' کہہ کر جیسے ہی وہ عورت شرم سے دوہری ہوگئی، مجھے اس کے پیچھے کھڑے گھوش بابو کا ہنستا مسکراتا چہرا نظر آ گیا۔ ہائے..... ہیلو کے بعد مجھے اپنے ادھ ننگے پن کا احساس ہوا تو میں دوڑ کے اپنے بیڈ روم میں گھس گیا۔ وہاں سے جب انسان کی جون میں باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گھوش بابو..... میرے فریج سے اپیل نکال کر خود بھی کھا رہے ہیں اور اپنی دھرم پتنی کو بھی کھانے کی تاکید کر رہے ہیں مگر وہ بیچاری میرے فون پر اپنی کسی سہیلی کو کوئی ضروری بات بتانے میں اتنا مشغول تھی کہ نہ اسے اپیل نظر آ رہا تھا اور نہ میں۔

میں نے زبردستی گلا صاف کیا اور کسی بری خبر کے لئے اپنے آپ کو تیار کر کے خود ہی پوچھ بیٹھا..... ''بتایئے گھوش بابو! کیا بات ہے جو صبح صبح پدھارے؟ سب ٹھیک تو ہے نہ؟''۔ میرے سوال سن کر گھوش بابو اتنے زور سے قہقہا لگائے کہ مجھے ڈرا دیا اور اپنی پتنی کو بھی چونکا دیا جو ابھی تک میرے فون پر مصروف تھی۔ وہ میری طرف ایک میٹھی مسکراہٹ پھینک کر پھر سے شرما گئی۔ ہائے ظالم نے کیسا تیر مار دیا جو دل کے آر پار ہوگیا۔ پتہ نہیں کیوں..... مجھے دوسرے کی بیوی ہمیشہ بہت پیاری لگتی ہے۔ شاید اس لئے کہ میری کوئی اپنی نہیں ہے۔ ''ہم نے سوچا کہ آج کا سنڈے تمہارے ساتھ گزارا جائے اور میں نے تمہاری اتنی تعریف کر دی ہے کہ تمہاری سندری بھابی ہمیشہ تمہارے گھر آنے کی ضد کرتی رہتی ہے۔ مجھے آج ٹائم ملا تو سوچا اس بیچاری کی منوکامنا پوری کر دوں''..... گھوش بابو چہک کر بولے۔ اتنے میں وہ بیچاری

، بھی فون سے فارغ ہو کر ہمارے پاس آ گئی اور اپنے پتی کی ہاں میں ہاں ملانے لگی۔

میں دل ہی دل میں کڑھ کر رہ گیا کہ کہاں میں ان کو سرپرائز دینے والا تھا اور اس کے لئے کیا کیا جتن نہیں کیا تھا مگر سب بیکار کر دیا سندری بھابی نے۔ جب میں نے کہا کہ..... ''دادا، اگر آنا ہی تھا تو کل مجھے آفس میں بتا دیتے یا پھر نو دس بجے آتے۔ اتنی صبح صبح بیچاری بھابی کو پریشان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' ۔تو گھوش بابو سے پہلے سندری بھابی بول پڑی..... ''ہائے دیور جی! آپ ٹھہرے کنوارے بچھڑے آدمی..... کب کدھر منھ اٹھا کے چل پڑینگے کیا پتہ؟ آپ کو صحیح وقت میں صحیح جگہ پر پکڑنے کے لئے ہی میں نے یہ پلان بنایا تھا۔ آپ کہتے ہیں اتنی صبح پر ابھی تو دن کے سات بج چکے ہیں، ہماری صبح کو تو دو گھنٹے ہو چکے ہیں''۔ میں نے نوٹ کیا کہ سندری بھابی..... بولتی کم ہے مگر ہنستی زیادہ ہے۔ کمبخت کی ہنسی بھی بڑی جان لیوا ہے!

اور اس جان لیوا مسکراہٹ نے سچ مچ میری جان ہی لے لی۔ میں نے اپنے کنوارے پن کا بھرپور مزہ لینے کے لئے کھانے پکانے کی مصیبت نہیں پالا تھا، اس لئے گھر میں کچن ہی نہیں تھا۔ دونوں کو لے کر دس بجے کے قریب گھر سے نکلا۔ اندرا گاندھی پارک، چڑیا گھر، پرانا قلعہ وغیرہ دیکھتے دکھاتے دن کے دو بج گئے تو لنچ لینے کے لئے کسی ہوٹل میں جانے کی بات نکلی ہی تھی کہ سندری بھابی نے جھٹ سے ہوٹل کا سلیکشن بھی کر دیا۔ جب ہم تینوں ہوٹل میں کھا پی کر سیر ہو گئے تو گھوش بابو باتھ روم کا کہہ کر چلے گئے۔ ان کی غیر موجودگی میں سندری نے میرے ساتھ جی بھر کے رومانٹک مذاق بھی کر ڈالا۔ جب آدھا گھنٹہ تک انتظار کے بعد بھی گھوش بابو نہیں آئے تو خود سندری بھابی نے کہا..... ''کیوں دیور جی، اب یہاں سے چلنا بھی ہے یا یہیں سے ڈنر بھی لے کر چلیں؟''۔ مرتا کیا نہ کرتا..... آٹھ سو روپئے بل چکانے کے بعد جب باہر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گھوش بابو گولڈ فلیک کو کش لے لے کر پان والے سے جیوتی باسو جی کی تعریفیں کر رہے ہیں اور وہ پان والا جو صورت شکل سے پیور بنگالی لگ رہا ہے منھ کھولے منڈی ہلا رہا ہے۔ ہمیں دیکھتے ہی کھل اُٹھے اور میرے کچھ

کہنے سے پہلے ہی بول پڑے..... ''کیا بات ہے طارق بابو! لگتا ہے دیور بھاوج میں کوئی کھچڑی پک رہی تھی۔ میں تو کافی دیر سے یہاں آپ لوگوں کے انتظار میں چار چار پان چبا چکا ہوں، اوپر سے پان والے دادا نے مجھے سگریٹ بھی پلادی''۔ اب میں اس شریف آدمی سے کیا کہتا کہ دن بھر میں اس نے مجھے جو چونا لگایا ہے اس کا رنگ مہینوں تک نہیں چھوٹے گا۔

دوسرے دن جب میں نے یہ بات سلمان کو بتائی تو وہ ہنستے ہنستے اپنا پیٹ پکڑ کر کراہنے لگا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ ہنس کیوں رہا ہے جب کہ اسے مجھ سے ہمدردی ہونی چاہیئے۔ جب میں نے ہنسنے کا کارن پوچھا تو وہ بولا..... ''بیٹا، تو بھی بن گیا نہ بلی کا بکرا۔ سندری کی سندر مسکراہٹ کا کچھ تو ٹیکس دینا پڑیگا نہ؟ ابے یار..... گھوش بابو سے سوگنا زیادہ خطرناک ہے یہ سالی سندری بھابی۔ مجھے بھی حلال کر چکی ہے رانڈ۔ تو شکر کر کہ تجھے سمجھانے کو میں ہوں مگر میرے کو سمجھانے کے لئے کونہیں تھا رے۔ میں تو سالا..... اس سے عشق بھی کر بیٹھا تھا۔ اور وہ بھی گھوش بابو کی غیر حاضری میں میرے ساتھ خوب گھومی، پھری، سنیما اور پارک گئی، شاپنگ کی اور میری تنخواہ کو اپنے باپ کا مال سمجھ کر خوب لٹایا۔ مگر ایک دن..... اتفاق سے جب میں اس کے گھر گیا تو اس کو گھوش بابو کے ساتھ دل کھول کے ہنستے ہوئے سنا۔ میں جلدی سے آڑ میں ہو گیا کہ کہیں گھوش بابو کی نظر میں نہ آجاؤں۔ اور پھر جب ان دونوں کی بات سنی تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے کہ سندری مجھے لوٹنے کا طریقہ بتا بتا کر ہنس رہی تھی اور وہ بے شرم..... مکھی چوس کی اولاد مزے لے لے کر سن رہا تھا اور ہنس رہا تھا۔ تب میری آنکھ کھلی کہ مجھے لوٹنے کے پلان میں دونوں پتی پتنی برابر کے شریک ہیں''۔

میں حیرت واستعجاب میں منہ کھولے بیٹھا تھا کہ سلمان نے دوسرا بم چھوڑ دیا اور یہ انکشاف کر کے مجھے چونکا دیا کہ..... ''تجھے پتا ہے طارق! یہ دونوں جتنے کنجوس ہیں اس سے بھی زیادہ شاطر و چالاک ہیں۔ کبھی کسی کو اپنے یہاں دعوت نہیں دیتے کہ خرچ کرنا پڑیگا۔ الٹا ہر سنڈے کو صبح صبح کسی دوست، رشتے دار یا جان پہچان والے کے یہاں مہمان بن کے پہنچ

جاتے ہیں۔ وہی ایک بہانہ جو تمہارے ساتھ کیا کہ..... ''ہم نے سوچا کہ آج کا سنڈے تمہارے ساتھ گزارا جائے اور میں نے تمہاری اتنی تعریف کر دی ہے کہ تمہاری سندری بھابی ہمیشہ تمہارے گھر آنے کی ضد کرتی رہتی ہے۔ مجھے آج ٹائم ملا تو سوچا اس بیچاری کی منوکامنا پوری کر دوں''۔ وہ بیچارہ دوست یا رشتے دار خوش ہو جاتا ہے کہ مہمان بھگوان کا روپ ہوتا ہے۔ مگر یہ دونوں شیطان دن بھر اس کا سارا رس چوس کر..... شام کی چائے یا رات کا کھانا کھا لینے کے بعد..... ہنستے کھیلتے گھر واپس ہوتے ہیں۔ پھر دوسرا سنڈے آتا ہے تو..... دوسرا بکرا ڈھونڈ لیتے ہیں۔ اسی طرح ہر سنڈے بنا کچھ خرچ کئے خوب انجوائے کرتے ہیں یہ دونوں حرام خور!''۔ میں نے پوچھا..... ''تجھے یہ سب راز کی باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟''۔ سلمان بولا..... ''بیٹا، تو نے وہ کہاوت تو سنی ہوگی کہ جس کا بیٹا دودھ پیتے جل گیا ہو اسکی ماں چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتی ہے۔ میں بھی ان دونوں کی میٹھی چھری سے حلال ہوا ہوں اور ایک راز کی بات بتاؤں، جب میرا سندری کے ساتھ چکر چل رہا تھا تو اس نے خود مجھے بتائی یہ بات۔ مگر تو فکر مت کر یار..... اب چار پانچ مہینے تک تیرا نمبر نہیں آئے گا۔ کیوں کہ یہی ان دونوں کا طریقہ ہے کہ جہاں ایک بار مہمان بن کر جاتے ہیں وہاں دوبارہ جلدی نہیں جاتے کہ میزبان کو شک ہو جائیگا۔ کم سے کم چار مہینے کا وقفہ ضرور رکھتے ہیں کہ مہمان اور میزبان دونوں خوش رہیں''۔

سلمان سے گھوش بابو کی کرامات کا ذکر سن کر مجھے اپنا چھوٹا سا شہر یاد آ گیا اور اس میں بسنے والے مخلص لوگوں کے درمیان کا وہ بے شرم کنجوس..... ہاڑی میاں بھی یاد آیا۔ جو اپنی کنجوسی کو گھوش بابو کی طرح شرافت کے پردے میں چھپاتا نہیں تھا بلکہ اپنی کنجوسی کو سرعام کیش کرتا تھا۔ ہاڑی میاں..... جس کا اصل نام تو شاید اب خود اسے بھی یاد نہیں ہوگا۔ عمر ساٹھ کے قریب، اونچا قد، دبلا پتلا جسم، چوڑی پیشانی، لمبی ناک، لومڑی کی طرح ہمیشہ تھرکنے والی آنکھیں، سر اور داڑھی کے بال بلیک اینڈ وائٹ، ماتھے پر سجدے کا بڑا سا نشان جو سجدہ لگانے سے نہیں بلکہ رگڑنے سے بنا تھا اور اجنبی لوگوں کو مرغوب کر دیتا تھا کہ یہ آدمی ضرور اللہ کا نیک

بندہ ہے۔ مگر جان پہچان والوں کا کہنا ہے کہ ہاڑی میاں نے آج تک جمعہ کی نماز کبھی تواتر سے نہیں پڑھی۔ کسی کٹھ مُلّا نے کہہ دیا تھا کہ لگاتار تین جمعہ کی نماز کا ناغہ کرنے والا مسلمان نہیں رہتا، اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہاڑی میاں ہر ایک جمعہ کی نماز کے بعد..... دو جمعہ غائب ہو جاتا ہے، پھر تیسرے جمعہ کو مسجد میں حاضر۔ یعنی کہ نماز میں بھی کنجوسی اور ایمان بھی سلامت رہا۔

کالو بھائی کے ہوٹل میں بیٹھ کر دن بھر گپیں لڑانا اور گُلِ بگاولی سے لے کر سلیم انارکلی تک کی کہانیاں سنانا اور درمیان میں سننے والوں میں سے چائے مانگ کر پی لینا تو کسی سے پان بیڑی۔ اگر کوئی دل والا ہوا تو ہاڑی میاں اس سے ناشتے کی فرمائش کرتے ہوئے نہیں شرماتا تھا۔ ہاں درمیان میں کالو بھائی کے ہوٹل کا سودا سلف بھی لے آتا تھا، بدلے میں دوپہر کا کھانا ہوٹل میں کھالیتا تھا۔ اگر کسی نے کہیں چلنے کو کہا تو اس کے ساتھ ہو جانا مگر ہر کام کا ٹیکس ضرور وصول کرنا وہ بھی بڑی بے شرمی سے یہ کہہ کر کہ ''ارے بھائی، بنا پٹرول کے گاڑی کیسے چلے گی؟''۔ میرے دادا جی سے میں نے سنا ہے کہ ایک بار ہمارے شہر (جو کہ اس وقت ایک بڑا سا گاؤں تھا) کے اکلوتی مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ گاؤں کے ہر گھر سے کچھ نہ کچھ چندہ لیا جائیگا۔ دادا جی مسجد انتظامیہ کمیٹی کے صدر تھے اور خود بھی سب کے ساتھ گھر گھر چندہ مانگنے جاتے تھے۔ جب سب لوگ ہاڑی میاں کے گھر گئے تو اس نے ایسا جواب دیا کہ میرے دادا جی جوتا لے کر چڑھ دوڑے اور بعد میں اسی وجہ سے مسجد کمیٹی کی صدارت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ آپ جانتے ہیں ہاڑی میاں نے کیا کہا تھا؟ بولا..... ''مسجد خدا کا گھر ہے، اس کی سجاوٹ میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیئے۔ ہم سب کو اس میں بڑھ چڑھ کر دامے، درمے، سُخنے، قدمے حصہ لینا چاہیئے۔ مگر خدا نے مجھے اتنا غریب بنایا ہے کہ میں آپ لوگوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ہاں اتنا ضرور کر سکتا ہوں کہ کبھی کبھی مسجد میں اذان دے دونگا''۔ بس اتنا ہی سُننا تھا کہ میرے دادا جی کا پٹھانی خون جوش میں آ گیا..... اور بات ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔

اتنی کنجوسی میں بھی ہاڑی میاں سات بار اجمیر شریف ہو آئے ہیں اور بڑے فخر سے خواجہ

ترتیب

۱۔	بے نظیر انشائیے..... پدم شری بیکل اُتساہی	۱۱
۲۔	شگفتہ شگفتہ انشائیے ترے.....ڈاکٹر بلند اقبال	۱۲
۳۔	اردو کے مزاحیہ ادب میں عمدہ اضافہ.....سہیل احمد صدیقی	۱۵
۴۔	جیتے جاگتے زندگی سے بھرپور انشائیے.....رضی الدین رضی	۱۶
۵۔	آپریشن لوٹ مار	۱۹
۶۔	بڑے میاں	۲۵
۷۔	ناک میں دَم ہے!	۳۴
۸۔	نشانِ مردانگی	۳۹
۹۔	مکھی چوس	۴۴
۱۰۔	ہوا آنے دو.....!!	۵۴
۱۱۔	آبیل مجھے مار!	۶۱
۱۲۔	آل راؤنڈر	۶۸
۱۳۔	پیٹ کا چکر	۷۳
۱۴۔	ہو جاتا ہے.....!!	۷۸
۱۵۔	بابا رے بابا	۸۴
۱۶۔	رانگ نمبر	۹۴
۱۷۔	کُتیا کی قسمت	۱۰۰
۱۸۔	زہریلے پتّے	۱۰۷
۱۹۔	غصّے کے سائڈ افیکٹس	۱۱۵
۲۰۔	افسانچے (دس منی افسانے)	۱۱۸-۱۲۸

خواجگاں فخر ہندوستاں کی درگاہ میں حاضری کی بات سناتے رہتے ہیں۔ کچھ سچی اور نوے فیصد اپنے تیز دماغ کی پیداوار۔ مجھے ہمیشہ حیرت ہوتی ہے کہ آخر ہر سال ان کے پاس اتنے روپے کہاں سے آجاتے ہیں جو یہ اجمیر شریف کی زیارت کر آتے ہیں۔ آخر ایک دن میں ہاڑی میاں کا یہ راز بھی پا گیا۔ ہوا یوں کہ کسی جلسہ میں ایک بڑے ہی جلیل القدر مولانا صاحب تشریف لائے تھے۔ ہاڑی میاں کو انکی خدمت کے لئے معمور کیا گیا تھا۔ اور مولانا صاحب ان کی خدمت سے خوش ہو کر ان کو یہ نسخہ بتا گئے تھے کہ..... ''اگر تمہاری اتنی حیثیت نہیں ہے کہ تم حج کو جا سکو تو پھر سات بار اجمیر شریف ہو آؤ، تمہارا حج ہو جائیگا''۔ جب ہاڑی میاں نے اپنی کنجوسی کو دباتے ہوئے ان سے گزارش کی کہ ''حضور، جب طریقہ بتائے ہیں تو براہ کرم راستہ بھی بتا دیجئے کہ میں غریب آدمی بار بار اجمیر شریف کیسے جاؤں؟''۔ تب مولانا صاحب نے ان سے ایک سو ایک روپیہ ہدیئہ لے کر وہ نسخہ ان کو پکڑا دیا جو ہاڑی میاں کو سات بار اجمیر گھما لایا۔ ہوتا یوں ہے کہ خواجہ صاحب کی عرس مبارک رجب المرجب کے مہینے میں ہوتی ہے اور ہاڑی میاں اس سے دو مہینے پہلے اپنے شہر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ شہر سے دور انہیں کوئی پہچاننے والا بھی نہیں ہوتا ہے۔ وہ مسلم اکثریت والے قصبوں کے چکر لگاتے ہیں۔ پنج وقتی نمازی بن جاتے ہیں۔ ہر نماز کے بعد دعاؤں میں گڑگڑاتے ہیں، آنسو بہاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لوگوں میں اچھا خاصہ رعب چھا جاتا ہے۔ پھر وہ ہانک لگاتے ہیں..... ''میں خواجہ اجمیری کے دربار میں حاضری دینا چاہتا ہوں۔ ہے کوئی خواجہ کا دیوانہ جو میری مراد پوری کر دے؟''۔ خواجہ معین الدین چشتی سنجری اجمیری کے دیوانے ہندوستان کیا، دنیا کے کونے کونے میں موجود ہیں جو ان کے نام پر کچھ بھی لٹانے کو تیار رہتے ہیں۔ ہر قصبے میں دس بیس خواجہ کے دیوانے مل جاتے ہیں جو ہاڑی میاں کے دامن کو بھر دیتے ہیں۔ دو مہینے میں پندرہ بیس گاؤں سے کم از کم پچاس ہزار سے اوپر کی آمدنی ہو جاتی ہے اور ہاڑی میاں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ مشکل سے پانچ دس ہزار کے درمیان زیارت کو خرچہ اور باقی مال سال بھر کے لئے بچت۔ واہ رے خواجہ اجمیری تیری شان! تجھے دیتے نہیں دیکھا مگر جھولی بھری دیکھی!!

آپ نے اپنے شہر میں یا گاؤں میں ضرور کچھ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہوگا جو یا تو دھوتی

اور بنیان میں ہوتے ہیں یا پھر لنگی گنجی میں اپنی پوری زندگی کاٹ لیتے ہیں۔ یہ لوگ کپڑا کنجوس ہوتے ہیں۔ آپ ان سے پوچھ کر دیکھیں وہ کتنی چالاکی سے گاندھی جی کو درمیان میں لے آئینگے کہ آخر وہ اتنے بڑے انسان تھے مگر کبھی شرٹ یا پنجابی نہیں پہنے۔ کچھ ایک کنجوس ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی شادی میں ملے جوتے کو سنبھال سنبھال کر..... اپنے بیٹے اور پوتے کی شادی تک پہنتے ہیں۔ پھر بھی وہ چک چک نظر آتا ہے کہ صرف خاص خاص موقعہ پر بکسے سے باہر نکلتا ہے اور تقریب کے ختم ہوتے ہی، اچھی طرح جھاڑ پھونک کر پھر بکسے کے اندر۔

ہمارے دوستوں میں کچھ ایک خاندانی کنجوس بھی ہیں۔ کالج کے دنوں میں میرا ایک دوست تھا جو..... آپ یقین کریں..... کبھی کورس کی کتابیں نہیں خریدتا تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ اس کا باپ اسے خریدنے کے لئے پیسے ہی نہیں دیتا تھا۔ اسکے باپ نے اسے اپنی مثال دیکر سمجھایا تھا کہ..... ''مجھے دیکھ بیٹا! میں نے کبھی کتابیں نہیں خریدی۔ دوستوں سے مانگ مانگ کر، لائبریری سے لے کر..... نہیں تو اچھا پڑھنے والے اسٹوڈینٹس کی نوٹ کاپیاں چوری کر کے گریجویشن کرلیا۔ تم بھی وہی کرو''۔ میرا وہ دوست اپنے باپ کی بات پر حرف حرف عمل کر رہا ہے، کاپیاں ہی نہیں پن اور پینسل بھی چُرا لیتا ہے۔ اور تو اور جب ہم سب دوست کبھی فلم دیکھنے جاتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ سب پیسہ دو ٹکٹ میں کٹاؤنگا۔ ہم سب سے پیسے لے کر وہ کاؤنٹر پر جاتا ہے، ٹکٹ لیتا ہے، پھر بلیک میں بیچ کر نفع کماتا ہے اور اس نفع کے پیسے سے اپنے ٹکٹ کا اور انٹرول کا خرچہ سنبھال لیتا ہے۔

دوستو! میں آج بھی اسی الجھن میں ہوں کہ آخر کنجوسی ایک موذی بیماری ہے یا پیدائشی صفت؟ جب ہمیں یہ معلوم ہے کہ ہر جاندار کو ایک دن موت کا مزہ چکھنا ہے۔ اور مرنے کے بعد ہم اور آپ ہی کیا..... بل گیٹس اور پریم جی بھی خالی ہاتھ قبر میں جائیں گے تو پھر کنجوسی کر کے دولت اکٹھا کرنے سے کیا فائدہ؟ جس دولت کو آپ نہیں آپ کے اہل وعیال عیش کریں اور مرنے کے بعد آپ کی برسی کا فاتحہ بھی نہ کریں..... ایسی دولت کو جوڑنے کا فائدہ؟؟ مگر ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ..... فضول خرچ کرنے والا شیطان کا بھائی ہوتا ہے!

☆☆☆

ہوا آنے دو !

''اللہ کرے اس تانیہ کی بچی کو ہیضہ ہو جائے۔ اسکے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں یا سر پھوٹ جائے جس کی وجہ سے میرا گھر لڑائی کا.....''

''خبردار امّی! تانیہ کو کوئی بددعا مت دینا۔ اسے کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ نہیں رہونگا''

''چپ کر بے شرم! باپ کے ساتھ لڑ جھگڑ کر تیرا دل نہیں بھرا جو میرے منہ لگ رہا ہے؟ سن لو تم دونوں باپ بیٹا، آج ابھی اسی وقت سے اس گھر میں دوبارہ اُس چڑیل کا نام کوئی نہیں لے گا۔ میرے گھر کا سکون غارت کر کے رکھ دیا ہے اس تانیہ نے۔ اگر تم دونوں پھر سے جھگڑے تو میں جان دیدونگی..... سنا تم دونوں نے؟''

پڑوس کے گھر سے جھگڑنے کی یہ آواز مجھے ڈسٹرب کر رہی تھی۔ پچھلے دو سال میں پہلی بار..... اس گھر سے کسی عورت کی اتنی تیز آواز میں نے سنی۔ ورنہ میں نے ہمیشہ مولوی فخرالدین صاحب کو اپنے اکلوتے بیٹے قمرالدین پر برستے ہوئے یا اسے ڈانٹتے سنا تھا یا پھر صبح سویرے قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان کی اہلیہ چیخ رہی تھیں اور مولوی صاحب چُپ تھے۔ میرا تجسس جاگا کہ آخر بات کیا ہے؟ کس سے پوچھوں؟ مولوی صاحب سے پوچھنا خلافِ تہذیب ہوگا۔ ہاں انکے بیٹے قمرالدین سے پوچھ سکتا ہوں۔ وہ میرا ہم عمر تو نہیں تھا، پانچ چھ سال جونیئر لگتا تھا، پھر بھی آتے جاتے کبھی ملاقات ہو جاتی تو علیک سلیک ہو جاتی تھی۔

قمرالدین جیسے ہی گھر سے باہر نکلا، میں نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ نزدیک آیا تو میں نے بیٹھنے کو کہا۔ پوچھا..... چائے پیو گے؟ اس نے سر کے اشارے سے منع کیا، پھر بھی میں تھرموس سے دو کپ چائے لے آیا۔ اسے کپ پکڑانے کے بعد میں سوچنے لگا کہ بات کیسے شروع کروں؟ دوسروں کے ذاتی معاملے میں دخل دینا کہاں تک مناسب ہو

گا؟ جوان لڑکا ہے اگر بگڑ گیا اور ایک دو ہاتھ جڑ دیا تو؟؟ پھر ہمت کر کے کہ جو ہوگا دیکھا جائیگا، میں نے پیار سے پوچھا..... ''دیکھو قمر! تم میرے چھوٹے بھائی جیسے ہو۔ حالانکہ میں تمہارا کوئی نہیں پھر بھی دو سال سے پڑوسی ہوں۔ اس ناطے تمہارے اوپر یا تمہارے گھر کے اوپر کوئی مصیبت آئے تو میرا پریشان ہونا لازمی ہے۔ ہے کہ نہیں؟'' وہ سر ہلا کے رہ گیا۔ ''اچھا، یہ تانیہ کون ہے، جس کی وجہ سے آج چچی جان سے تمہارا جھگڑا ہو گیا..... اور تم دونوں ایک دوسرے کو جان دینے کی دھمکی دے رہے تھے۔ کیا تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو اور مولوی صاحب راضی نہیں ہیں؟''

قمر میری بات سن کر کھلکھلا کر ہنسنے لگا (میری جان میں جان آئی) اور ہنستے ہوئے بولا..... ''ارے طارق بھائی! ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو آپ سوچ رہے ہیں۔ اور آپ تانیہ کو نہیں جانتے، حیرت کی بات ہے۔ آج ہر طرف اس کا ڈنکا بج رہا ہے۔ وہ جس نے کرکٹ اور سچن دونوں کا بھاؤ کم کر دیا ہے۔ وہی احمد آباد کی تانیہ خان جو آجکل ٹینس کی دنیا میں ہندوستان کا نام روشن کر رہی ہے اور جس کا ذکر دنیا کے ہر اخبار و ٹیلی ویژن چینل میں چل رہا ہے، آپ اسے نہیں جانتے؟ کس دنیا میں رہتے ہیں؟''۔

میں حیرت میں پڑ گیا کہ ایک اجنبی لڑکی..... وہ بھی ایک کھلاڑی لڑکی کے لئے، مولوی فخر الدین صاحب کے گھر میں جھگڑا؟ جب میں نے یہی بات قمر سے کہی تو وہ بول پڑا..... ''بھائی جان، حقیقت میں جھگڑا میرے اور امی کے درمیان نہیں تھا۔ امی بیچاری تو بیچ بچاؤ کی کوشش میں چیخ رہی تھیں۔ اصل میں جھگڑا کل رات میرے اور ابو جان کے درمیان ہو گیا تھا تانیہ کو لے کر۔ اور میں کہاں جھگڑا کر رہا تھا، یہ تو ابو جان ہی زبردستی اپنی منطق میرے اوپر لاد رہے تھے۔ وہ جو کہیں صحیح..... ہم جو کہیں غلط!''

میں اور بھی زیادہ تجسس میں پڑ گیا کہ..... تانیہ کو لے کر مولوی صاحب اور انکے بیٹے کے درمیان جھگڑا، آخر کیوں؟ کس بات پر؟ کیا تانیہ ان کے دور کی رشتہ دار لگتی ہے یا پھر کوئی اور بات ہے؟ میرے دل کی کیفیت زبان تک آ ہی گئی تو قمر نے بھی اپنے دل کا بھڑاس

نکال دیا۔ بولا..... ''آپ ہی انصاف کرو طارق بھائی، کہ میں غلط ہوں یا ابو جان؟ کل رات ہم تانیہ کا میچ دیکھ رہے تھے۔ جب وہ سارا پوبھا سے ہار گئی تو..... ابو جان جھٹ سے بول پڑے..... ''ایسے ادھ ننگے کپڑے پہن کر کھیلے گی تو ضرور ہارے گی''۔ میرا دماغ تو اس کی ہار سے پھرا ہوا تھا، میں نے بھی کہہ دیا'' اور جب جیت رہی تھی، اس وقت تو آپ کبھی نہیں بولے اس طرح کی بات؟ تب ابو جان..... جھٹ سے اسلام کو لے آئے درمیان میں، بولے..... '' تانیہ مسلمان ہے، اس کو ایسے پوشاک پہننا لازم نہیں۔ دوسری مسلم لڑکیوں پر اس کا غلط اثر پڑتا ہے۔ شرم و حیا نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہم مسلمان ہیں تو ہمیں اسلامی ڈریس پہننا چاہیئے''۔ میں نے کہا..... ''واہ کیا بات ہے، تانیہ منی اسکرٹ اور ٹی شرٹ پہن کر ٹینس کھیلتی ہے تو اس کو دیکھ کر ہماری دوسری مسلم لڑکیوں پر غلط اثر پڑیگا، اس لئے اس کو برقعہ پہن کر کھیلنا چاہیئے۔ اور جو آپ کے زمانے کی ہندی فلم کی ہیروئین نرگس، ثریا، ریحانہ سلطانہ کر رہی تھیں اور آجکل ہمارے زمانے کی صنوبر کبیر، شمع سکندر اور نگار خان وغیرہ تین چوتھائی جسم دکھا کر..... ریمیکس گانوں میں کولہے مٹکاتی ہیں، چھاتیاں ہلاتی رہتی ہیں، اس کا کیا؟ کیا اس سے ہماری بہن، بیٹیوں پر اچھا اثر پڑتا ہے؟ کیا ان سب کے لئے بھی اسلامک ڈریس کوڈ نہیں ہونا چاہیئے؟؟''

میری بات سے ابو جان بگڑ گئے اور بولے..... ''نابکار، باپ سے زبان درازی کر رہا ہے۔ انگریزی تعلیم نے تیری آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ تو کیا جانے اسلام کیا ہوتا ہے؟ اور اسکے اصول کیا ہوتے ہیں؟ ہفتے میں ایک بار قرآن شریف نہیں پڑھتا ہے بے شرم..... الٹا مولوی فخرالدین سے بحث کر رہا ہے؟'' میں نے کہا..... ''ابو! بات یہ نہیں ہے کہ میں قرآن ہفتے میں کتنی بار پڑھتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ آپ مولوی لوگ ہمیشہ ہر بات میں، جب ہارنے کو ہوتے ہو تو..... اسلام کو کیوں لے آتے ہو درمیان میں؟ میں قرآن کم اسکے ترجمے کو زیادہ پڑھتا ہوں تا کہ اسے ٹھیک طرح سمجھ سکوں۔ اور قرآن مجید میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا ہے کہ انگریزی پڑھنے سے آنکھوں پر پٹی بندھ جاتی ہے یا عورتوں کو سر سے لے کر پیر

تک ڈھکے رہنا چاہیئے۔ قرآن تو علم حاصل کرنے کو کہتا ہے اور اللہ کے رسول ﷺ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ علم حاصل کرنے کے لئے اگر چین بھی جانا پڑے تو جاؤ۔ یہ نہیں کہا کہ صرف مرد لوگ جاؤ اور عورتوں کو مت لے جاو۔ بات تانیہ اور اسکے ڈریس کی ہو رہی ہے اور آپ مجھے اسلام اور اسکے اصول کی پاٹھ پڑھا رہے ہیں۔ تانیہ نے آج اچانک ٹینس کھیلنا شروع نہیں کیا، برسوں سے کھیل رہی ہے۔ تب آپ مولوی، مفتی اور دھرم کے ٹھیکیدار سب کہاں تھے؟ آج جب وہ مشہور و معروف ہوگئی ہے، چاروں طرف اس کا چرچا ہو رہا ہے..... سب واہ واہ کر رہے ہیں تو آپ جیسے کچھ مولوی کو اچھا موقع ملا ہے کہ چلو بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیتے ہیں، کسی مشہور شخصیت کے اوپر کیچڑ اچھال دیتے ہیں، مفت کی پبلیسٹی مل جائیگی۔''

میری باتوں سے ابو کا چہرہ غصے سے لال ہونے لگا تھا، لگے دھاڑنے..... ''کیا اسی دن کے لئے تجھے پال پوس کر بڑھایا لکھایا تھا کہ تو ایک بے حیا لڑکی کے لئے میرا اور..... میرے اللہ اور رسول کی توہین کرے۔ دین اسلام کے خلاف بات کرے اور اپنی عاقبت کو خراب کرے۔ تیرے جیسی اولاد سے تو بے اولاد ہونا ہی بہتر ہے۔ تو کیا جانے دین کیا ہے اور اسکے لئے ہم لوگوں نے کیا کیا قربانیاں دی ہیں''۔ مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے کہا..... ''ابو جان، آپ کہتے ہیں دین اسلام کے لئے آپ جیسے مولویوں نے قربانیاں دی ہیں۔ جب کہ سچائی تو یہ ہے کہ اسلام کو ان مولویوں نے جتنا نقصان پہنچایا ہے اس کی بھرپائی مشکل ہے۔ چند ضمیر فروش اور شہرت کے بھوکے مولویوں کی وجہ سے آج ہمارا مذہب اسلام غیر مسلموں کے لئے مذاق بن گیا ہے۔ طلاق، نکاح، فیملی پلاننگ وغیرہ جیسے مسئلوں پر بنا سوچے سمجھے..... قرآن و حدیث کو طاق میں رکھ کر اپنے من سے فتوی دے دیتے ہیں۔ چند منٹ کے لئے ٹی وی پہ آجاتے ہیں مگر سزا پاتے ہیں ہم عام مسلمان جو طرح طرح کے سوالات کا سامنا کرتے ہیں، شرمندگی سے سر اٹھا نہیں پاتے ہیں۔ میں بے دین نہیں ہوں۔ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی توہین کرنا (نعوذ باللہ) تو دور کی بات ہے میں ایسا خواب میں بھی سوچ نہیں سکتا۔ مگر اللہ و رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ کسی بھی بات کو بنا پرکھے، بغیر بحث کئے قبول مت کرو، ورنہ کسی

جادوگر..... کو پیر یا پیغمبر سمجھ کر اسکی تقلید کرنے لگو گے۔ آپ مولوی لوگ تانیہ کے کھیل کو دیکھیں..... تانیہ کو نہیں۔ جب آپ اسکے کھیل سے ہٹ کر اس کو دیکھنے لگتے ہیں تو وہ آپ کو ادھ ننگی لگتی ہے۔ آج کل ہر مولوی کے گھر میں ٹیلی ویژن ہے اور گھر کی عورتیں مزے سے سیریل دیکھتی ہیں جو کہ فلموں کی طرح لڑکے لڑکیوں کے آزادانہ میل جول، بوس وکنار سے بھر پور ہوتے ہیں۔ گھر میں ماں، بیٹی، بیٹا، بہو، ناتی پوتا سب ساتھ ساتھ دیکھتے ہیں..... اور مولوی صاحب بھی اکثر و بیشتر موجود ہوتے ہیں۔ سب ساتھ مل کر بے شرمی کا ننگا ناچ دیکھتے ہیں۔ کیا اس وقت حضرت کو خیال نہیں آتا کہ یہ سب ہماری مسلم لڑکیوں پہ غلط اثر ڈال رہا ہے اور پورا معاشرہ اخلاقی تنزلی کا شکار ہو رہا ہے۔''

میری باتوں نے جلتی پہ تیل کا کام کیا اور ابو جان غصے اور پشیمانی سے تھرانے لگے۔ اگر میں جوان، ہٹا کٹا نہیں ہوتا تو شاید جوتا نکال کر میرے اوپر ٹوٹ پڑتے۔ پھر بھی گرجتے ہوئے بولے..... ''نکل جا مردود، ابھی اسی وقت میرے گھر سے۔ میری نظروں سے دور ہو جا۔ میں تیرا باپ نہیں اور تو میرا بیٹا نہیں۔ میں تجھے عاق کرتا ہوں!''۔ میں بھی غصے میں تھا بول پڑا..... ''ٹھیک ہے میں نکل جاتا ہوں اس گھر سے جہاں سچ بولنے سے بیٹا..... بیٹا نہیں رہتا۔ مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے اُس گھر میں رہنے کی جہاں آپ جیسا ہٹلر باپ رہتا ہو جو دوسروں پر نکتہ چینی کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہو اور جب انگلی خود اس کی طرف اٹھنے لگے تو..... تلملا کر فتوی کا، قرآن کا، حدیث کا سہارا لے لیتا ہو۔ آپ جیسے دو غلے مولویوں نے مذہب کو اپنے گھر کی لونڈی سمجھ رکھا ہے، جب جیسا جی چاہا نچا دیا۔ یاد رکھیئے..... وہ دن دور نہیں جب آج کی یہ نوجوان نسل آپ لوگوں کو عزت و احترام تو دور..... سلام کرنا بھی چھوڑ دے!''۔ میں اتنا کہہ کے گھر سے نکل گیا۔ امی روتی رہ گئیں مگر میں اپنے دوست کے یہاں چلا گیا تھا۔ ابھی صبح میں یہاں صرف اس لئے آیا ہوں کہ اپنے کپڑے اور کتابیں لے جاؤں مگر امی مجھے روک رہی ہیں۔ میں نہیں رکونگا اس جیل میں۔ اب آپ ہی بتاؤ طارق بھائی..... ''کیا سچ کہنا گناہ ہے؟ تانیہ کا ذکر خود ابو نے شروع کیا اور بحث و تکرار ہوتی ہے تو کچھ منفی، کچھ مثبت

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

باتیں بھی ہوتی ہیں۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ مجھے ماں کی گالی دیں کہ نکل جا میرے گھر سے تو میرا بیٹا نہیں ہے۔میں نہیں رہونگا یہاں، بالکل نہیں رہونگا۔''

میں حیرت زدہ اسکی باتوں کو سن رہا تھا۔میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہوں تو کیا کہوں؟ قمر جو کچھ بول رہا تھا وہ اسکی عمر کا تقاضہ اور اسکے کھلے ذہن کا نتیجہ تھا۔اسکی باتیں بھی دل کو لگتی تھیں کہ آجکل ہمارے قومی رہنما لوگ ذرا ذرا سی بات پہ فتوی صادر کر دیتے ہیں اور پوری قوم کو اسکا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔فخر انسانیت، محبوب ملت حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ.....'' ایک دور ایسا آئیگا جب جاہلوں کی طرف سے فتویٰ جاری کئے جائیں گے جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں اور جو بالکل بے بنیاد بات ہوگی''۔اور آجکل ہمارے ملک میں یہی ہو رہا ہے۔ہم اسی نازک دور سے گزر رہے ہیں۔آج ہر مسجد کا امام خود ساختہ مفتی ہے اور سستی شہرت اور دولت کی خاطر اپنی غیرت وحمیت تک کو داؤ پر لگا دیتا ہے، قوم گئی بھاڑ میں۔

بہر کیف، میں نے کچھ بولنا بھی تھا تا کہ قمر کو سمجھا سکوں تا کہ وہ گھر چھوڑ کے نہ جائے۔اکلوتی اولاد کا غم مولوی صاحب تو شاید برداشت کر لیں مگر انکی بیوی.....وہ بیچاری یہ غم برداشت نہیں کر پائیں گی۔یہی سوچ کر میں نے گلا صاف کیا اور کہا.....'' دیکھو قمر! تم نے جو کچھ بھی کہا وہ سب اپنی جگہ ٹھیک ہے کہ تانیہ پچھلے پانچ چھ سال سے کھیل رہی ہے اور اب جب دنیا میں مشہور ہونے لگی ہے تو اسکی شہرت سے فائدہ اٹھانے کے لئے کچھ ایک مولوی، مولانا اسکے کپڑے کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔یہ بات بھی صحیح ہے کہ اسلامی ڈریس کوڈ میں تانیہ ٹینس نہیں کھیل سکتی مگر میرے بھائی، مجھے ایک بات بتاؤ؟ تم ٹینس میچ دیکھتے ہو تو صرف تانیہ کا میچ نہیں بلکہ دوسرے میچیس بھی دیکھتے ہو گے۔ذرا بتاؤ..... دنیا کا نمبر ون ٹینس کھلاڑی روجر فیڈرر، نمبر دو کھلاڑی رافیل ناڈال، انڈرے اگاسی اور خود ہمارے ملک کے لیئنڈر پیز اور مہیش بھوپتی بھی دنیا میں کافی نام کما رہے ہیں۔کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ لوگ ہاف پینٹ اور ہاف شرٹ پہن کر کھیلتے ہیں۔رافیل ناڈال تو گھٹنے کے نیچے تک کا پینٹ پہن کر کھیلتا ہے اور کئیک گرانڈ سلام جیت چکا ہے۔کیا ان لوگوں کو کپڑوں سے پریشانی نہیں ہوتی؟ کیا ان لوگوں کا

ٹینس تانیہ کے ٹینس سے الگ ہے؟؟

میں نے دیکھا کہ قمر دیوار پہ نظر گڑائے میری بات سن رہا ہے۔اس کا مطلب یہ کہ میری بات کو سمجھ بھی رہا ہے اور سوچ بھی رہا ہے۔یہی صحیح موقع تھا،اس لئے میں نے دوبارہ بولنا شروع کیا'' دیکھو قمر.....تانیہ ہندوستان کی ہے،تانیہ مسلمان ہے،تانیہ جیت رہی ہے اس لئے ایک مسلمان ہونے کے ناطے تم اس سے جذباتی طور سے جڑ گئے ہو۔کھیل ضرور دیکھو مگر اس کو اپنا جنون مت بناؤ۔تم تانیہ کو زیادہ سے زیادہ پانچ سال سے جانتے ہو مگر اپنے ابو اور امی کو ۲۵ سال سے جانتے ہو۔انہوں نے تمہارے لئے کیا کچھ نہیں کیا،مگر آج تم ان کو چھوڑنے کو تیار ہو گئے ہو۔بولو کیا یہ ٹھیک ہے؟ تانیہ کو اسکے کھیل کے لئے،ٹریننگ کے لئے،کوچ کے لئے،آمد و رفت کے لئے کئی ایک کمپنیاں مالی مدد دے رہی ہیں،تبھی وہ اس مقام تک پہنچی ہے۔اب یہ اس کی مجبوری ہے کہ وہ ان مدد کرنے والی کمپنی کی بھی مدد کرے ورنہ مفت میں کوئی کسی کے لئے کچھ نہیں کرتا؟ وہ وہی پہنتی ہے جو اسکی کمپنی چاہتی ہے۔اب تو یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ تانیہ خان کو فلم کا آفر مل رہا ہے۔اگر وہ فلموں میں آ گئی تو وہ بھی دوسری ایکٹریس کی طرح ہیرو کے ساتھ بوس و کنار کے مناظر کریگی.....کو لیے منکا ئیگی وغیرہ وغیرہ۔کیا تم اس وقت یہ سب برداشت کر سکو گے؟؟

اس سے پہلے کہ میں اپنی بات پوری کرتا۔پتہ نہیں کیا ہوا۔قمر اُٹھ کر دوڑا۔میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔میں عجیب پس و پیش میں پڑ گیا تھا۔دن بھر پریشان رہا۔مغرب کی نماز کے بعد اچانک مولوی فخرالدین صاحب کو مع قمرالدین کے اپنے سامنے دیکھ کر میں ڈر گیا کہ اللہ خیر! مولوی صاحب نے مجھ سے پہلے ہی سلام کہہ دیا اور بولے.....'' بیٹا،تم نے مجھ پہ بہت بڑا احسان کیا ہے۔ہم بوڑھے ماں باپ کے عمر بھر کی کمائی ہے یہ قمرالدین۔جو کل مجھ سے جھگڑ کے گھر سے جا رہا تھا۔اگر آج تم اسے نہیں سمجھاتے تو وہ اپنی غلطی کا احساس نہیں کر پاتا اور نہ مجھ سے معافی مانگتا،بہت ضدی ہے۔تمہارا بہت بہت شکریہ بیٹے،چلو قمر کی امی تمہارا چائے پہ انتظار کر رہی ہیں۔آج سے ہمارے دو بیٹے ہیں،ایک تم اور دوسرا.....یہ برخوردار!!

☆☆☆

﴿ دیارِ غیر میں میرے اپنے جہاں سے آپ یہ کتاب حاصل کر سکتے ہیں ﴾

☆ محمد لقمان خان، مدینہ منورہ ☆

Tamimi Company, P.O.Box-186, Mahata Al-Awaji, Airport Road, MADINA(KSA)

☆ نادر خان سرگروہ، ''اردو گلبن''، سعودی عربیہ ☆

Mobilr No: 0996556628877, E-mail: tabdeeli@yahoo.com

☆ سالم احمد باشواعر، ''اردو بندھن''، جدّہ ☆

National Commercial Bank, P.O.Box-3555, JEDDAH-21481.

Mob:0966504645616, E-mai: salembashwar@hotmail.com

☆ م.شین.کامل، سعودی عربیہ ☆

OFC-BLS, P.O.BOX-1520, AL-KHOBAR-31952, SAUDI ARABIA

☆ رضی الدین رضی، پاکستان ☆

73-A, JALILABAD COLONY, MULTAN, PAKISTAN

☆ زبیروارثی، مدیر ماهنامه ''زاویه'' سوئیڈن ☆

KALLAREKROKEN 25, 22647 LUND, SWEDEN

☆ جلوید دانش، کینیڈا ☆

1574, MAJOR OAKS ROAD, PICKRING, ON. L1X 2J7 CANADA

☆ سارہ جبین، ''اردو بندھن''، امریکہ ☆

2225 Birmingham Drive, Shiloh, IL-62221 (USA)

E-mail:

☆ مظفراحمد مظفر، ''اردو بندھن''، انگلینڈ ☆

273 Maldan Road, New Maldan, Surrey, KT3 6AH, LONDON

Mob:+7930565948 E-mail:muzaffar96@hotmail.com

☆ عاکف غنی، فرانس ☆

3 Place des Vergers, 95140 Garges-les-Gonesse, FRANCE

☆ ارشد اقبال آرش، اٹلی ☆

Via Bochherini 109, 09045 Quartu S.E. (CA) ITALY

Please make all your payments only to SK. MONIRUDDIN
payable at AXIS Bank,(India). A/c.No- 3980101000-021696

آبیل مجھے مار!

غالباً جب ہم پانچویں جماعت میں تھے تب پہلی بار ہماری ملاقات اس محاورہ ''آ بیل مجھے مار'' سے ہوئی تھی۔ اللہ ان کی لحد پہ نور افشانی کرے، مولوی رحیم الدین (مرحوم) ہمارے صدر مدرس تھے، اردو اور فارسی ایسے پڑھاتے تھے کہ سبق کلاس میں ہی یاد ہو جایا کرتا تھا، کبھی ٹیوشن کی ضرورت نہیں پڑی۔ ویسے بھی ہمیں اردو کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی خوش فہمی تھی۔ ہم سوچتے تھے کہ اردو ہماری گھریلو زبان ہے (مادری زبان اسلئے نہیں کہہ رہے ہیں کہ ہمارے والد صاحب اور والدہ دونوں کی زبان اردو ہے، اگر ہم اسے مادری زبان کہہ دیتے ہیں تو ہمارے ابا حضور کی دل شکنی ہو جائیگی، آپ ہی بتایئے کہ جنت میں جانے کے لئے ہم جنت کے دروازے کو ناراض کیسے کر سکتے ہیں؟)۔ ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ اردو کو ہم اپنے گھر کی زبان سمجھ کر ہمیشہ ان دیکھا کرتے تھے۔ مگر اس دن جب مولوی رحیم الدین صاحب نے ''آ بیل مجھے مار'' محاورے کا مطلب فرداً فرداً تمام بچوں سے پوچھا تو ہمیں ہماری اردو دانی کا محل مسمار ہوتا ہوا نظر آیا۔ ایک ایک بچے کو کھڑا کر کے پوچھتے جاتے تھے اور غلط ہونے پر اپنے ٹریڈ مارک ''بولتی چھڑی'' سے نوازتے جاتے تھے۔ ہمیں احساس ہو گیا تھا کہ آج ہماری خیر نہیں۔ آج مولوی رحیم الدین صاحب کی بولتی چھڑی ہم سے کچھ نہ کچھ بُلوا کر رہیگی۔ پتہ نہیں انکا نام رحیم الدین کس نے رکھا تھا۔ کسی طرف سے بھی رحم نام کی کوئی چیز ان میں نظر نہیں آتی تھی۔ انکا نام تو قہر الزماں ہونا چاہئے تھا۔ بات بات پہ چھڑی لیکر ٹوٹ پڑتے تھے، کہتے تھے میری بولتی چھڑی کے آگے گونگے بھی بول اٹھتے ہیں۔ ہمارے والدین اپنے بچوں کا نام یہ سوچ کر رکھتے ہیں کہ شاید نام کے اثر سے بچہ بڑا ہو کر نام کمائے گا مگر ہوتا اسکا اُلٹ ہے۔ ہمارے علاقے کے سب سے بڑے بھائی (دادا) کا نام محمد شریف ہے۔ اب انکے والدین بیچارے قبر میں تڑپ رہے ہونگے کہ کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا اور ایک

صاحب ہیں بابا امیر حسین صاحب، جنکی پوری زندگی گاؤں گاؤں پھیری لگاتے گزر گئی اور جب انکے بچے بڑے ہو کر کسی قابل ہو گئے تو انہوں نے امیر حسین صاحب کو آزاد کر دیا۔ اب موصوف پھیری لگانے کے بھی قابل نہیں رہے، اس لئے اپنے وہیل چیئر میں بیٹھ کر بازار میں بھیک مانگ کر گزارا کر رہے ہیں۔ شاید اسی لئے مشہور انگریز ادیب شیکسپیئر نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ..... نام میں کیا رکھا ہے؟!

ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ مولوی رحیم الدین صاحب نے کلاس میں آبیل مجھے مار والے محاورے کا مطلب پوچھا تھا۔ ہم سوچ رہے تھے کہ خدا کرے جب تک ہمارا نمبر آئے، گھنٹی بج جائے، پیریڈ ختم ہو جائے مگر..... ایسا کچھ نہیں ہوا اور انہونی ہو کر رہی۔ جب ہمارا نمبر آیا تو ہم نے مولوی رحیم الدین صاحب کی آنکھوں کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔ پہلے ہم آدھا کھڑے ہوئے تھے مگر جیسے ہی مولوی صاحب نے اپنا داہنا ہاتھ سیدھا کیا، ہم یکدم سیدھے ہو گئے۔ مولوی صاحب نے کہا..... بیٹا محمد فاضل، تم بتا دو پورے کلاس کو کہ آبیل مجھے مار کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ ہم انکے منہ سے محبت سے لبریز لفظ بیٹا سن کر باغ باغ ہو گئے اور سوچا کہ ہو نہ ہو مولوی صاحب مارتے مارتے تھک گئے ہیں اب سچ مچ رحم کا پیکر بن جائیں گے۔ ہم نے بھی نڈر ہو کر کہہ دیا..... '' آبیل مجھے مار کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی طالب علم اپنا سبق یاد نہیں کیا ہوتا ہے اور دل ہی دل میں مولوی صاحب کی مار کو ڈرتا ہوا اسکول آ رہا ہوتا ہے تو راستے میں اس کو ایک بیل نظر آتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر یہ بیل مجھے زخمی کر دے تو میں دو چار دن گھر یا اسپتال میں پڑا رہونگا اور مولوی صاحب کی مار سے بچ جاؤنگا۔ یہ سوچ کر وہ بچہ بیل سے مخاطب ہو کر کہتا ہے..... '' آبیل مجھے مار !''۔

خدا جھوٹ نہ بلوائے، ہمیں آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے جواب نے کیا ایسا جادو کر دیا کہ مولوی صاحب اتنا ہنسے..... اتنا ہنسے کہ بیہوش ہو گئے۔ ہم اور دو چار بچے جب انکو لیکر انکے گھر گئے اور انکی اہلیہ نے یہ سنا کہ مولوی رحیم الدین صاحب ہنستے ہنستے بیہوش ہو گئے ہیں تو یقین کریں وہ بھی سکتے میں چلی گئیں۔ جب انھیں ہوش آیا اور ہمارے

ساتھیوں نے بتایا کہ مولوی صاحب کو ہمارے جواب نے ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا تو انہوں نے ہمیں ڈھیر سارا پیار دیا اور بولیں..... ''تم بڑے ولی صفت بچے ہو، آج جو کام تم نے کر دکھایا ہے وہ میری پنج گانہ دعاؤں نے بھی نہیں کیا۔ تم ایک دن بہت بڑے آدمی بنو گے اور اپنے ماں باپ کا نام ضرور روشن کرو گے''۔ اب اللہ ہی جانے کہ انکی دعا میں اثر ہوئی یا نہیں مگر میں بہت بڑا نہ سہی..... ایک سرکاری آفس میں کلرک ضرور بن گیا ہوں۔

قارئین کرام! آپ لوگوں کو ہمارا..... آبیل مجھے مار والا جواب بہت اٹ پٹا سا لگا ہوگا۔ ہمیں بھی لگتا ہے۔ مگر ہم اُس وقت صرف دس سال کے تھے اور پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ مگر آج بھی (جب ہم اپنے آدھے بال کلر کی کرتے ہوئے سفید کر چکے ہیں) ہمارا وہ جواب ہمیں حرف حرف یاد ہے۔ ایک بار تو ہم نے اُس جواب کا عملی مظاہرہ بھی کر کے دیکھ لیا ہے۔ یقین مانیے ہمارے بچپن کے اُس جواب نے ایک بار ہمیں سسپینڈ ہونے سے بھی بچا لیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوا کہ بیل کی جگہ ہم نے کار سے کہا کہ آ کار..... مجھے مار۔ قصہ مختصر یوں ہے کہ ہم ہیں ایک سرکاری کلرک، تنخواہ چار ہزار۔ ایسے میں ایک عدد بیوی، پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا..... پورے آٹھ عدد پیٹ کیسے بھر سکتے ہیں؟ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ والدین سمجھدار تھے اور جلدی اللہ کو پیارے ہو گئے ورنہ.....؟ اب آپ شکایت کریں گے کہ اتنی کم آمدنی تھی تو اتنے سارے بچے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اب ہم آپ سے کیا چھپائیں، اس میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں تھا اور نہ ہے۔ یہ ڈیپارٹمنٹ تو ہماری نصف بہتر کا ہے۔ ہم نے ہر بار اولاد ہونے پر انھیں سمجھایا کہ..... ''دیکھو بھاگوان، بیٹی ہو یا بیٹا، اولاد تو اولاد ہوتی ہے، ہم ان کو اچھی تعلیم و تربیت دینگے، نیک انسان بنائیں گے اور اپنا فرض نبھا کر بھول جائیں گے''۔ مگر ہر بار ہماری اہلیہ نے ہم سے وعدہ کیا اور پھر بھول گئیں۔ وعدہ نہیں بھولیں..... فیملی پلاننگ کی گولی لینا بھول گئیں (یہ راز تو ہمیں اپنی چھٹی اولاد یعنی کہ بیٹا ہونے کے بعد ہماری اہلیہ نے خود بتایا کہ وہ ایک بیٹا پیدا کرنا چاہتی تھیں جو خاندان کو آگے چلائیگا، اسلئے جان بوجھ کر گولی لینا بھول جاتی تھیں۔ اب ان کو کون سمجھائے کہ..... کیا بیٹیاں خاندان سے الگ ہوتی ہیں؟

تو ہم کہہ رہے تھے کہ ہماری تنخواہ سے ہمارے پریوار کا گزر بسر نہیں ہوتا تھا۔ ہم اپنی تنخواہ کی بچت کرتے تھے اور اوپر کی آمدنی سے گھر کا خرچ چلاتے تھے۔ اوپر والا نوازتا تھا اور گزر بسر اچھی طرح ہو جاتی تھی۔ اچھی کیا، بہت اچھی زندگی دی تھی ہم نے اپنے بچوں کو۔ کلر ٹیلی ویژن، ڈی بی ڈی، فریج، فون..... کیا نہیں تھا ہمارے گھر میں۔ کمی تھی تو صرف موبائل فون کی۔ اسکول، کالج میں ان کو شرمندگی نہ ہو اور بچے احساس کمتری کا شکار ہو کر پڑھائی سے منہ نہ پھیر لیں، اس لئے ہم نے ان کو موبائل فون دینے کا وعدہ کر لیا (بڑی بیٹی نے تو شرم سے کالج جانا ہی بند کر دیا تھا) اُس وقت ہماری پارٹی کی سرکار تھی اور ہمارے بدن کی گرمی سے اچھے اچھے بھی اُبل جاتے تھے۔ شہر کے سب سے بڑے موبائل شوروم کا مالک مخالف پارٹی کا تھا۔ ہم صرف پانچ ہزار پھینک کر، چار موبائل اس سے لے لئے۔ وہ ہمارا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا کہ صاحب اتنے کم میں موبائل کیا اسکا چارجر بھی نہیں ملے گا۔ آبیل..... راستہ روک والی بات ہو گئی۔ ہم غصے میں موبائل پٹک کر اپنا روپیہ لے کر آفس آ گئے اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر بلکنے لگے۔ ہمارے بڑے صاحب کمیشنر دیا شنکر یادو جی ہم سے بے حد محبت رکھتے تھے (کیونکہ انکی آمدنی کا ذریعہ ہماری سیٹ سے ہو کر گزرتا تھا)۔ جب انھیں ہماری بھیگی پلکوں کا اور لٹکے چہرے کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے اپنی محبت کا حق ادا کر دیا اور پوری ٹیم کے ساتھ موبائل شوروم پہ چھاپا ڈال دیا۔ وہ حزب مخالف جو ہمیں چار موبائل پانچ ہزار میں نہیں دے رہا تھا اب گھگھیا رہا تھا۔ واپسی میں کمیشنر یادو جی کے پاکٹ میں بیس ہزار کی گڈی پھڑ پھڑا رہی تھی اور میرے پاس چار موبائل فون کے ساتھ ساتھ پانچ ہزار کی رقم ہچکولے کھا رہی تھی۔ ہم خوشی خوشی گھر لوٹے۔ مگر ہماری خوشی کو صرف تیرہ دن ہی گزرے تھے کہ ہماری پارٹی کو ایک سخت جھٹکا لگا اور ہماری سرکار گر گئی۔ کلن سیٹھی کی پارٹی نے سمرتھن واپس لیکر حزب مخالف کو دیدی۔ انکی سرکار بن گئی اور ہم یتیم ہو گئے۔ موبائل شوروم والے کو بدلہ لینے کا موقع مل گیا۔ اُس نے اپنی پارٹی کے نیتا سے ضد کر کے ہمارے ڈیپارٹمنٹ پہ سی، بی، آئی کا چھاپا ڈلوا دیا۔ ہمارے بڑے صاحب نے ہمیں فون پہ اطلاع دیکر جلدی آفس آنے کو کہا تو..... ہمیں باتھ روم آنے جانے

سے فرصت ہی نہیں ملی۔ ڈر کے مارے ہاتھ پاؤں ہی نہیں..... بلکہ آنکھ، کان، ناک اور دماغ بھی کانپنے لگے۔ ہم نے صاحب کو فون کر کے اپنی حالتِ غیر بتائی اور چھٹی کی درخواست کی تو وہ..... آپے سے باہر ہو گئے اور بولے..... ''جب ہمارے ساتھ کباب کھا رہے تھے تو اُس وقت کبھی آپ کے پیٹ میں گڑبڑ نہیں ہوئی۔ آج جب چھاپا پڑا ہے تو آپ چھپنے کا بہانہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ آپ کا کوئی بہانہ نہیں چلے گا، جلدی آفس پہنچیئے ورنہ.....''۔ اب ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ تھرتھراتے ہوئے وجود کے ساتھ موٹر سائیکل چلانا ہمیں ٹھیک نہیں لگا۔ اسلئے ہم پیدل ہی بس اسٹاپ کی طرف نکل پڑے۔

سُنا ہے، جب آدمی کا بُرا وقت آتا ہے تو اسے اپنے پرائے یاد آتے ہیں، ان کی اچھی بُری باتیں یاد آتی ہیں۔ ہمیں بھی اپنے والد صاحب کی بات یاد آئی جب وہ بسترِ مرگ پہ ہم سے کہہ رہے تھے اور ہم بے دلی سے سُن رہے تھے۔ انھوں نے کہا تھا..... ''بیٹا حلال کی کمائی کا پیوند لگا ہوا چادر، حرام کے مخملی کمبل سے بہتر ہوتا ہے''۔ پھر ہمیں مولوی رحیم الدین صاحب بہت یاد آئے۔ انکی باتوں کی سختی میں چُھپا سچائی کا عکس ہمارے سامنے یکے بعد دیگر آنے جانے لگے۔ اچانک ہمیں انکی ''آبیل مجھے مار'' والی بات یاد آ گئی۔ جیسے کالی کالی گھنگھور گھٹاؤں کے بیچ اچانک بجلی چمک اُٹھتی ہے تو کچھ پل کے لئے چاروں طرف روشنی بکھر جاتی ہے۔ ہمارے دماغ کے اندھیرے میں امید کی بجلی چمک اُٹھی کہ ہم کس طرح آفس جانے سے بچ سکتے ہیں اور..... شاید جیل جانے سے بھی۔ ہم نے ہر طرف سے کھنگال کر دیکھ لیا کہ ہمارا آئیڈیا بالکل صحیح ہے۔ اس میں کوئی قانونی اڑچن نہیں ہوگا اور ہمارے بڑے صاحب بھی ہمیں نوکری سے نکال نہیں پائینگے۔ ہم خوشی سے جھوم اُٹھے اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنی پیٹھ تھپ تھپانے کی ناکام کوشش کی۔

تقریباً دس منٹ تک راستے کے کنارے انتظار کرنے کے بعد ہمیں ہمارے مطلب کی ایک کار آتی ہوئی نظر آئی جسے ایک پکی عمر کی فیشن زدہ عورت مستی میں چلا رہی تھی۔ ہم تیار ہو گئے اور جیسے ہی وہ ہم سے دس قدم کی دوری پر آئی تو ہم نے آنکھ بند کر کے ''آ..... کار، مجھے

مار'' کہہ کر اس کے آگے چھلانگ لگادی۔ وہ عورت شاید رت جگے کی عادی تھی یا پھر نشے میں کہ اس نے ہمارے دونوں پاؤں کے اوپر گاڑی چڑھانے کے بعد بریک لگائی۔ ہمیں بس اتنا یاد ہے کہ آس پاس کے لوگ دوڑتے ہوئے ہماری طرف آرہے تھے۔ اُس کے بعد جب ہماری آنکھ کھلی تو ہمیں لگا ہم کسی دوسری دنیا میں ہیں۔ چاروں طرف عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بہت ہی پیاری مہک فضا میں بسی ہوئی تھی۔ دودھ سے زیادہ سفید دو حسین و جمیل لڑکیاں ہمارے سرہانے کھڑی تھیں۔ ہم نے سوچا کہ شاید ہم سڑک سے سیدھے جنت کو سدھارے ہیں مگر جب اپنے گناہوں کی گٹھری یاد آئی تو ہم پورے ہوش میں آگئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے بڑے صاحب بہت ہی شفقت بھری مسکان اپنے چہرے پہ سجائے ہمارے ہاتھوں کو سہلا رہے ہیں۔ بعد میں انہوں نے بتایا..... ''بھائی محمد فاضل، آپ نے کمال کر دیا۔ کیا غضب کا دماغ پایا ہے۔ آپ نے خود کو اور ہمیں بچانے کا جو آئیڈیا نکالا وہ یکدم فُل پروف تھا۔ آپکے حادثے کی خبر جب منتری جی کی بیوی نے دی اُس وقت سی بی آئی والوں کے سوالوں کی بوچھاڑ کے آگے ہم پانی پانی ہو رہے تھے۔ حادثے کا سُن کر پورا آفس ہسپتال کی طرف بھاگا (آخر سی بی آئی والوں سے اپنی جان جو بچانی تھی)۔ آپ پورے تین دن کے بعد ہوش میں آئے ہیں۔ آپ جس کار سے ٹکرائے تھے وہ ہمارے ہیلتھ منسٹر کی پتنی چلا رہی تھیں۔ آپ کو اس ہسپتال میں انھوں نے ہی بھرتی کروایا ہے اور منتری جی نے آپ کی دونوں ٹانگوں کے لئے پچاس ہزار کی رقم کا اعلان بھی کیا ہے۔ فاضل صاحب، آپ کی تو نکل پڑی! مگر ایک بات بتایئے کہ یہ آئیڈیا آپکے دماغ میں آیا کیسے؟''

اب آپ ہی بتائیں دوستو کہ ہم ان سے کیسے کہیں کہ کبھی کبھی بچپن کی احمقانہ باتیں بھی بڑھاپے میں کام آجاتی ہیں۔ خدا مولوی رحیم الدین مرحوم کے صغیرے کبیرے گناہوں کو بخش دے۔ اگر انھوں نے بچپن میں ''آبیل مجھے مار'' کا مطلب نہیں پوچھا ہوتا تو.....؟؟؟

☆☆☆

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

آل راؤنڈر

ہمارے شفی بھائی پان والے نے زندگی میں کرکٹ کمنٹری سُننے کے علاوہ اور کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا تھا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، انھیں ریڈیو پر کرکٹ کمنٹری سنتے ہی دیکھا ہے۔ اِن دنوں تو خیر ٹیلی ویژن کا دور ہے اور شفی بھائی پان والے نے بھی ایک سیٹ قسطوں پہ لے لیا ہے۔ ان کا اسم شریف تو شیخ شفیع الدین ہے مگر..... گھٹتے گھٹتے وہ صرف شفی بھائی رہ گئے ہیں۔ سب کے شفی بھائی، پورے علاقے کے شفی بھائی۔ بزرگ بھی کہتے ہیں اور چھوٹے بچے بھی جب دکان پہ آتے ہیں تو وہ بھی انھیں شفی بھائی کہتے ہوئے نہیں جھجکتے۔ ان کی پان کی دکان ہمارے اسکول سے تقریباً پچاس میٹر دور ہے اور ہم لوگ جب بھی کوئی کلاس پھلانگنے کی سوچتے تھے تو بھاگ کر شفی بھائی کی دکان کے آڑ میں چھپتے تھے۔ اور کلاس ختم ہونے کے بعد نکل آتے تھے۔ بے چارے شفی بھائی ہمیں اکثر سمجھاتے، اپنا میٹرک فیل ہونے کا قصہ بڑے غمگین انداز میں سُناتے مگر ہم لوگ..... اگر سمجھانے سے سمجھ جایا کرتے تو آئے دن اسکولوں اور کالجوں میں مارا ماری، دنگا فساد، چھیڑ چھاڑ وغیرہ نہیں ہوتے۔ اِن دنوں ہمارے اسکول اور کالج تو..... غنڈہ گردی، بھائی گری اور نیتا گری کی ٹریننگ سینٹر بن چکے ہیں۔ دس دس، پندرہ پندرہ سال کے لڑکے اپنی ایک جیب میں موبائل اور دوسرے میں چاقو، چھری یا پستول لے کر اسکول آتے ہیں۔ صرف آتے ہی نہیں بلکہ اُستادوں کو دھمکاتے بھی ہیں۔ ایسے میں انھیں 'سمجھانے' کا جوکھم کون لے گا؟!

مگر میں اُن دنوں کی بات کر رہا ہوں جب ٹیلی ویژن ہر گھر کی ضرورت نہیں بنا تھا۔ گاؤں میں جس کے پاس فیلپس کا ریڈیو ہوتا تھا وہ چھاتی پھُلا کر چلتا تھا اور شام کے وقت ٹکڑ پہ تاش کی بازی ہوتی تھی اور ریڈیو پر سیلون لگا کر فلمی گیت فُل ساؤنڈ سے سُنا جاتا تھا۔ امین سیانی کا بنا کا گیت مالا سُننے کے لئے ایک ریڈیو کے اردگرد اتنے لوگ جمع ہو جاتے تھے کہ

لگتا تھا میلا لگا ہوا ہے۔ گانے کا مزہ لیتے تھے، ایک دوسرے کی چٹکی لیتے تھے، لڑتے تھے، جھگڑتے تھے مگر پھر کوئی مشترکہ پسند کا گیت آجاتا تھا تو ایک دوجے کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر ٹھمکا بھی لگا لیتے تھے۔ مگر جب سے یہ شیطانی ڈبہ آیا ہے..... نہ وہ گاؤں رہا نہ وہ گاؤں کے چوپال۔ سب سمٹ کر گھر کے اندر چلے گئے ہیں۔ یاری، دوستی، رشتے ناطے سب سمٹ گئے ہیں۔ آپسی بھائی چارہ اب صرف دلوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، زبان تک نہیں آتا۔ زبان دل کا اور دل زبان کا ساتھ نہیں دیتا ہے۔ ٹیلی ویژن پہ ''مہابھارت'' آتا ہے تو بازار سُنسان ہو جاتے ہیں۔ سب اپنے اپنے گھر کو دوڑتے ہیں، اکیلے اپنے پریوار کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ الف لیلیٰ آتا ہے تو..... پڑھائی بند، چولھا چکی بند۔ پہلے سیریل دیکھ لیں گے پھر کوئی کام۔ ہمیں بے انتہا حیرت اس دن ہوئی جب باتوں باتوں میں ہمارے عزیز دوست اسلام الدین نے بڑے فخر سے کہا کہ ''بھائی ہم تو ہمیشہ اپنے اصول پر چلتے ہیں، آٹھ بجے کا سماچار سُننے کے بعد عشاء کی نماز پڑھتے ہیں، پھر ''گھر گھر کی کہانی'' دیکھتے ہوئے رات کا کھانا کھا لیتے ہیں تاکہ ساڑھے دس بجے جب تُلسی (کیونکہ ساس بھی کبھی بہو تھی) آئے تو مزے سے دیکھ سکیں، اُسکے بعد سو جاتے ہیں!''۔ یعنی کہ اب نمازیں اور پوچا پاٹھ بھی سیریل کے ٹائمنگ کے ساتھ ایڈجسٹ کئے جاتے ہیں..... تاکہ سیریل نہ چھوٹ جائے۔ خدا خیر کرے!!

معذرت چاہتا ہوں کہ بات شفی بھائی پان والے کی ہو رہی تھی اور میں..... ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہمارے شفی بھائی ہم لوگوں سے بہت پیار کرتے تھے اور ضرورت پڑنے پر ہمیں اُدھار بھی دیدیا کرتے تھے۔ اُدھار نہ چکانے پر بھی کبھی بات والد صاحب تک نہیں جاتی تھی۔ اس لئے ہم سب بھی ان سے بہت پیار کرتے تھے۔ ہمارے دن کا ایک بڑا حصہ اُنکی دُکان پر گزرتا تھا۔ تبھی ہمیں احساس ہوا کہ شفی بھائی کرکٹ سے اتنا پیار کیوں کرتے ہیں؟ ایک دن ان کی ہی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ وہ بھی ہماری طرح اسکول میں کلاس چھوڑ کر کھیلنے چلے جاتے تھے۔ وہ گلی ڈنڈے کے مانے ہوئے کھلاڑی تھے۔ گلی چاہے کتنے ہی زور سے اور کتنا ہی اوپر کیوں نہ مارا گیا ہو..... شفی بھائی اسکو محمد کیف کی طرح لپک لیتے تھے اور جب ڈنڈا

مجھے صرف اتنا کہنا ہے.....

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو ہم سب کا پالن ہار ہے۔ بنانے مٹانے، مارنے جلانے..... ہنسانے اور رُلانے والا ہے۔ جس کے حکم کے بنا پتا بھی نہیں ہلتا تو میں کیا اور میری بساط کیا جو میں کچھ لکھ پڑھ سکوں۔ یہ اس کی رحمت کا صدقہ ہے کہ مجھے اردو زبان سے محبت کرنے والے والدین ملے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے کہ مجھے حضور بڑے سرکار قبلہ اور حضور چھوٹے سرکار قبلہ کے سایۂ شفقت میں سانس لینے کا موقع ملا۔ آج جو کچھ بھی ہوں یہ سب ان کی محبت، شفقت اور..... نسبت کا نتیجہ ہے ورنہ بھدرک جیسی بنجر زمین میں اردو زبان و ادب کی بات ایتھوپیا میں آئس کریم فیکٹری لگانے جیسی ہے۔ یہ سب ممکن ہوا ہے حضور چھوٹے سرکار (ماما جیؔ) کی انتھک کوشش اور اردو زبان و ادب سے بے انتہا لگاؤ کی وجہ سے۔ انہوں نے ''بزم فیض و فراق - بھدرک'' کے بینر تلے چار چار عالمی مشاعرے کروائے اور ''ادبی مرکز، بھدرک''، جیسی تنظیم بنا کر ہم جیسے بے ادب نوجوانوں کو اردو زبان و ادب کی خدمت کے لئے تیار کیا۔ بھدرک سے اردو ادب کا منفرد رسالہ ''روزن'' نکال کر عالمی اردو ادب کو یہ پیغام بھی دیا کہ فاصلے چاہے کتنے بھی ہوں زبان و ادب دلوں کو جوڑتی ہے، اجنبیت کو توڑتی ہے اور منزل مقصود تک پہنچنے کا حوصلہ دیتی ہے، شرط یہ ہے کہ ایمانداری سے کوشش کی جائے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ ماما جیؔ کا سایۂ عاطفت ہمارے سروں پہ تادیر قائم رہے۔ آمین!

اب میں کیا کہوں..... مہاکوی ٹیگورؔ کی طرح میں بھی چاہتا تھا کہ اپنی شاعری میں غریب، نادار، مظلوم لوگوں کی بپتا لکھوں۔ ان کی مفلسی، بے بسی، بے روزگاری اور درد و الم کی داستان قلم بند کروں۔ ایسی تصویر کشی کروں کہ قاری کے ذہن میں انمٹ نشان چھوڑ جاؤں اور

انکے ہاتھ میں ہوتا تھا تو اتنے سلیقے سے مارتے تھے کہ گلی ہمیشہ فیلڈروں کے درمیان سے نکل جاتا تھا، کوئی پکڑ نہیں پاتا تھا۔ ان کی ہی زبانی سُنیئے ''خدا جھوٹ نہ بلوائے کئی بار تو ہم اپنے علاقے سے باہر کے قصبوں میں بھی کرائے پر کھیلنے گئے ہیں (کاؤنٹی کرکٹ کی طرح)۔ لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا، ابھی ایک بار ہی میٹرک فیل ہوا تھا کہ والد صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ پانچ بہنوں کا اکیلا بھائی، کرتا بھی تو کیا کرتا۔ دُکان پہ والد صاحب کی جگہ لے لی۔ پھر ہندوستان نے کرکٹ میں ورلڈ کپ جیت کر..... گاؤں سے گلی ڈنڈے کا رواج ہی ختم کر دیا۔ تب سے ہم بھی کرکٹ کے شیدائی ہو گئے ہیں''۔

کرکٹ سے انکا عشق والہانہ ہے، خاص کر جب ہندو پاک میچ ہو رہا ہو۔ انکی دکان پر ایک جم غفیر ہوتی تھی۔ لوگ دو گروپ میں بٹ جاتے تھے۔ اور شفی بھائی موقع محل دیکھ کر کبھی ہندوستان کی طرف اور کبھی پاکستان کی طرف ہو جایا کرتے تھے۔ آخیر میں ہمیشہ انکی ہی ٹیم جیتتی تھی..... وہ چاہے ہندوستان ہو یا پاکستان، جیتنے والی ٹیم ہمیشہ اُن کی ہوتی تھی۔ وہ کھیل کی کمنٹری میں ایسے کھو جاتے کہ انھیں صرف اتنا یاد رہتا..... پچاس بال..... ساٹھ رن..... اور صرف دو وکٹ باقی ہے۔ ایک وکٹ اور گرا، شفی بھائی کی دکان سے ایک شور اُٹھا، ایک چوکا لگا..... شفی بھائی کی دکان سے تالیوں کی گڑگڑاہٹ دور دور تک سُنائی دیتی۔ کمنٹری سُنتے جاتے، پان کا بیڑا موڑتے جاتے تھے..... ساتھ ساتھ ہر گیند اور رَن کا حساب بھی رکھتے تھے۔ ایسے میں کوئی سائیکل سوار یا موٹر سائیکل سوار گزرتے ہوئے زور سے ہانک لگاتا..... شفی بھائی، اسکور کیا ہوا ہے؟ اور شفی بھائی جھٹ سے کسی ماہر اسکورر کی طرح بول پڑتے..... ۱۹۲ فور ۴ اِن ۲۴ اوور!

میں انکی دکان میں بلاناغہ روز بیٹھا کرتا تھا، مجھے بھی کرکٹ سے پیار ہے۔ مگر میرے والد صاحب کو کرکٹ کے نام سے اتنی نفرت ہے کہ کیا بتلاؤں.....؟ ایسے میں شفی بھائی کا ہی سہارا تھا جہاں جا کر میں کمنٹری سُن کے دل کو سکون پہنچاتا تھا۔ وہاں بیٹھ کر میں نے ایک بات نوٹ کی ہے کہ جب میچ اپنے کلائمکس پر ہوتا ہے اور ہر گیند اور ہر بال کی گنتی ہو رہی

ہوتی ہے..... ٹھیک اُسی وقت..... شفی بھائی کی دکان میں گاہکوں کی بھیڑ ہو جایا کرتی ہے۔ کوئی کچھ خریدتا ہے کوئی کچھ۔ میں نے اس راز سے پردہ اُٹھایا کہ آخر ٹھیک اسی وقت ہی گاہک کیوں آتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جب میچ سنسنی خیز موڑ پہ ہوتا ہے تو ہمارے شفی بھائی کا مکمل دھیان اُدھر ہی ہوتا ہے اور صرف کان گاہکوں کی طرف۔ ایسے میں چند چالاک نوجوان فائدہ اُٹھاتے ہیں اور..... چار پان لینے کے ساتھ ساتھ، آٹھ روپیہ اور کما لیتے ہیں۔ آپ نہیں سمجھے نا؟ ہوتا یہ ہے کہ..... شفی بھائی کا دھیان میچ کی طرف ہوتا ہے، ایسے میں وہ اُن سے کہتے ہیں..... بھائی چار پان تو دینا اور شفی بھائی بنا ان کی طرف دیکھے، چار پان موڑ دیتے ہیں۔ دھیان مگر رہتا ہے کرکٹ کی طرف۔ پھر وہ لوگ بولتے ہیں..... ''ارے بھائی، باقی کا پیسہ تو واپس کرو، ہمیں جانا ہے''۔ اور ہمارے شفی بھائی بغیر پیسے لئے ہی ان سے پوچھ بیٹھتے ہیں..... آپ نے کتنا دیا تھا؟ میں نے دس کا نوٹ دیا تھا۔ اور شفی بھائی، بنا کوئی حُجت کئے چار پان کے دو روپے کاٹ کے باقی آٹھ روپے انھیں واپس کر دیتے ہیں۔ گاہکوں کی چاندی ہو جاتی ہے، چار پان بھی اور..... آٹھ روپے کا بونس بھی! میں نے یہ راز شفی بھائی کو بتا کر دوستی کا حق ادا کر دیا اور دوسرے ہی دن شفی بھائی نے مجھے اپنے گھر رات کے کھانے کی دعوت دیکر میرا احسان چکا دیا۔ اس خلوص کا کیا کہنا! آج تو یہ عالم ہے کہ آپ کسی پر احسان کرتے ہیں اور وہ صرف دو لفظ..... ''تھینک یُو'' بول کر ایسے بھول جاتا ہے جیسے آپ نے نہیں بلکہ اُس نے آپ پہ احسان کیا ہو۔ انگریزیت نے انسانیت کو بھی نہیں چھوڑا ہے!

کرکٹ سے شفی بھائی کے جنونی عشق کا اندازہ مجھے ایک اور واقعہ سے ہوا۔ میں ملازمت کے سلسلے میں دو سال دہلی میں رہا۔ شفی بھائی کو میری کمی محسوس ہوتی تھی تو ایک پوسٹ کارڈ لکھ دیا کرتے تھے۔ پورے دو سال میں انہوں نے مجھے بیس پوسٹ کارڈ لکھے جو آج تک میں نے سنبھال کے رکھے ہیں۔ میرے گھر والوں نے بھی اتنے خط نہیں لکھے تھے۔ انہی دنوں کا ذکر ہے کہ انگلینڈ میں کرکٹ ورلڈ کپ ہو رہا تھا۔ محمد اظہر الدین کی قیادت میں انڈیا کی ٹیم ایک کانٹے کے میچ میں، زمبابوے جیسی چھوٹی ٹیم سے ہار گئی تھی۔ ہم سب کو بے حد دُکھ

تھا اور دہلی میں تو کئی ایک جگہ ٹیلی ویژن سیٹ بھی توڑے گئے تھے اور کچھ ایک جگہوں پر امپائر اور کچھ ایک علاقے میں اظہر الدین کے خلاف مظاہرے بھی ہوئے تھے۔ اُس دن سے ٹھیک ایک ہفتے بعد کی بات ہے کہ مجھے آفس بوائے نے ایک پوسٹ کارڈ لا کر دیا۔ دیکھا تو شفی بھائی کا خط تھا۔ خط کیا تھا..... انڈیا کے ہار جانے کا دُکھ، ہارنے کی وجہ اور تو اور ایک جگہ جذبات میں آ کر شفی بھائی نے مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ ''کیا ہم اظہر کو کپتانی سے ہٹا دیں؟''۔ خط پڑھ کر میں اتنا ہنسا کہ سانسیں اُکھڑنے لگیں۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ ہمارے شفی بھائی کرکٹ کی کتنی سمجھ رکھتے ہیں۔ کاش اتنی سی سمجھ ہمارے کرکٹ کنٹرول بورڈ میں ہوتی تو آج سو کروڑ کی آبادی والے ملک کو آسٹریلیا اور ساؤتھ افریقہ جیسے چھوٹے ملکوں سے ہارنے کی نوبت نہیں آتی۔ کب وہ دن آئیگا جب ہماری انڈین ٹیم..... کھلاڑی کی قابلیت کو دیکھ کر چُنی جائیگی نہ کہ دھرم اور علاقے کو دیکھ کر۔ جب تک انڈین ٹیم میں..... دہلی کے تین، ممبئی کے تین، ساؤتھ کے دو، بنگال کے دو اور مُسلمان ایک یا دو کا..... ہٹوارا ہوتا رہیگا، ہماری ٹیم ورلڈ کپ ہارتی رہیگی۔ کسی حق دار کا حق مار کر آپ کبھی اپنا حق نہیں پا سکتے!

بات یہ نہیں کہ شفی بھائی پان والے کو کرکٹ سے کیا ملا؟ بات یہ ہے کہ اسی کرکٹ کے شوق کی وجہ سے آج شفی بھائی ہندو مسلم سب کے شفی بھائی ہیں۔ کرکٹ اگر دلوں کو جوڑتا ہے تو ذریعہ بنے ہیں ہمارے شفی بھائی۔ بازار میں ان کی دکان ہی واحد جگہ ہے جہاں ہمارے ہندو بھائی بھی آ کر پان کھاتے ہیں اور کنٹری سُنتے رہتے ہیں ورنہ پچھلے فساد کے بعد بازار بھی دو رنگوں میں رنگ گئے ہیں..... سبز اور نارنگی!!

☆☆☆

پیٹ کا چکر

سُنا ہے کہ دنیا میں ۹۹ فیصد جھگڑے زر، زن اور زمین کے لئے ہوتے ہے۔ مگر ہمیں لگتا ہے کہ سو فی صد جنگ و جدال، لڑائی جھگڑے، مار پیٹ، گالی گلوج وغیرہ صرف اور صرف پیٹ کے لئے ہوتے ہیں..... پیٹ کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ پیٹ کے کارن ہی یہ دنیا ہے ورنہ اس میں رکھا ہی کیا ہے۔ فرشتوں کو، دیوی دیوتاؤں کو بھوک نہیں لگتی، کھانے پینے کی کوئی فکر نہیں ہوتی ہے اسلئے وہ ہمیشہ عبادت میں لگے رہتے ہیں۔ اگر ان کا بھی پیٹ ہوتا تو.....؟؟؟ پیٹ اور دنیا کا بہت گہرا تعلق ہے۔ ان دونوں کے رشتے کو جوڑتا ہے پیشہ۔ جتنی طرح کے پیٹ اتنی طرح کا پیشہ۔ ہر پیشہ کا مقصد ہے پیٹ پوجا..... یا پھر پیٹ کا منھ بند رکھنا۔

پیٹ کے آگے اچھے اچھوں کی دبتی ہے۔ چھٹانک بھر کا یہ پیٹ ہاتھی کو بھی ہلکان کر دیتا ہے آدمی کس کھیت کی مولی ہے۔ پیٹ کے بارے میں سوچنے سے بہت پہلے ہی پیٹ انسان کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ ہم دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے.....نو مہینے ماں کے پیٹ میں چین وسکون سے رہتے ہیں، بیچ بیچ میں ہاتھ پاؤں چلا کر ماں کو بے سکون کر دیتے ہیں۔ پھر بھی پیٹ ہمیں کچھ نہیں کہتا ہے، ہماری لات کھالیتا ہے اور چُپ رہتا ہے۔ نو مہینے تک ہماری ناز برداری کرتا ہے، ہمیں تل سے تاڑ بناتا ہے۔ پھر ہم جیسے ہی ماں کے پیٹ سے دھرتی پر وارد ہوتے ہیں ہمارا اپنا چھوٹا سا پیٹ اپنی ڈیوٹی شروع کر دیتا ہے۔ ہر لات کا بدلہ لے لیتا ہے۔ ہر دو گھنٹے میں.....ہمیں پیٹ کے لئے چلانا پڑتا ہے اور ہماری ماتائیں بھاگ بھاگ کر پیٹ پوجا کا بندوبست کرتی رہتی ہیں۔

دنیا میں جتنی طرح کے لوگ ہیں اتنی طرح کے پیٹ بھی ہیں۔ گول پیٹ، لمبا پیٹ، چوڑا پیٹ، چپٹا پیٹ، سمٹا ہوا پیٹ، پچکا ہوا پیٹ، پھولا ہوا پیٹ، وغیرہ وغیرہ۔ ان سب میں پھولا ہوا پیٹ سب کو دور و نزدیک سے اپنے ہونے کا احساس دلا دیتا ہے۔ ویسے پھولے

ہوئے پیٹ بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں مثلاً ہانڈی کی طرح، ڈھول کی طرح، مٹکی کی طرح وغیرہ۔ ان کے بارے میں ہم پھر کبھی بات کریں گے۔ تو ہم کہہ رہے تھے کہ ہمارے پیدا ہوتے ہی پیٹ کی کہانی شروع ہو جاتی ہے۔ پیٹ پوجا کے لئے ہمیں کیا کیا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ پیٹ میں دانا نہ ہو تو آدمی دیوانہ ہو جاتا ہے۔ پیٹ بھرنے کے لئے کچھ بھی کر جاتا ہے۔ کچھ نہ ملے تو اپنے بھائی کا گوشت بھی کھا جاتا ہے۔ حلال حرام کی تمیز...... بس کتابی باتیں ہیں! اور جب پیٹ میں کھانا زیادہ ہو جاتا ہے تو...... مشکلیں اور بڑھ جاتی ہیں۔ کچھ لوگ جب کھاتے ہیں تو بس کھاتے ہی چلے جاتے ہیں یہ نہیں سوچتے کہ سانس لینے کے لئے...... اُسکے آنے جانے کے لئے بھی تھوڑی بہت جگہ چاہیئے۔ اگر آپ گلے تک کھا لینگے تو پھر دم اٹکے گا ہی...... جھٹکے لگینگے ہی، جان جانے کی نوبت آسکتی ہے۔ سُنا ہے کہ دنیا میں جتنے لوگ بھوک سے کھانے کو ترس ترس کر مرتے ہیں اُس سے ڈھائی گنا زیادہ لوگ...... زیادہ کھا جانے کی جہ سے بیماری میں مبتلا ہو کر مرتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کھاتے پیتے لوگ کچھ کم کھا کر اپنے بھوکے پڑوسی کا بھی خیال رکھا کریں تو یہ دنیا زمین کی جنت ہو جائے۔ ہے نا؟!

ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ انسان کو جتنی طرح کی بیماریاں ہوتی ہیں ان میں سے اسی فیصد بیماریاں پیٹ کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ پیٹ درد سے لے کر پیٹ مروڑ، پیٹ کاٹنا، گیس ہو جانا، کیڑے پیدا ہو جانا وغیرہ تو روزمرّہ کی بیماریاں ہیں۔ لیکن جو بیماری پیٹ کو سب سے زیادہ بگاڑتی ہے وہ ہے...... حرام خوری یا مفت خوری۔ اگر فری میں مل جائے تو ہفتے بھر کا کھانا ایک ہی وقت میں کھا جانا اسکے بعد بھلے ہی دو تین دن تک دم گھٹتا رہے۔ مفت خوری کو سب سے زیادہ بڑھاوا دیا ہے ہمارے...... سیاست دانوں نے۔ یہ نیتا لوگ پیدائشی حرام خور ہوتے ہیں...... میرا مطلب ہے مفت خور ہوتے ہیں۔ اور ان کے آگے پیچھے بھاگنے والے چیلا لوگ ان سے بھی دو ہاتھ کیا...... دو میل آگے ہوتے ہیں۔ یہ اور ان جیسے مفت خوروں کی وجہ سے ہمارے دیس کا کھانا اور خزانہ دونوں خالی ہو رہے ہیں، مگر ان کے پیٹ پر بل نہیں پڑتے اور نہ مروڑ اٹھتے ہیں۔ ان کے پیٹ...... گنپتی بپا موریا کے پیٹ کو بھی شرما دیتے ہیں،

اُس سے بھی زیادہ بڑے ہوتے ہیں۔ پھوکٹ میں کھانے کی جو بیماری ان کو لگی ہے وہ شاید قیامت تک ٹھیک نہیں ہوگی۔ یہ حرام خوری ایڈز جیسی موذی مرض سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اتنی خطرناک کہ جس کو بھی لگ جائے وہ..... اچھے برے، حلال حرام تو دور کی بات..... اپنے پرائے کو بھی بھول جاتا ہے۔ یہ گنیش پیٹ والے نیتا لوگ جب کھانے پہ آتے ہیں تو..... انسان تو دور جانوروں کے، چرندے پرندوں کے چارے بھی کھا جاتے ہیں اور بناڈکارے ہضم بھی کر جاتے ہیں۔ مادر وطن کی عزت بچانے میں شہید ہوئے فوجی نوجوانوں کے کفن تک بیچ کھاتے ہیں۔ یہ کھانے پہ آئیں تو کیا کیا کھا جاتے ہیں کہ..... خدا جب آسماں سے زمین پر دیکھتا ہوگا تو خود سے کہتا ہوگا کہ..... دنیا بنانے والے کا ہے کو پیٹ بنائی!

ہماری ایک عدد دادی ماں (ایک عدد اس لئے کہ اُس زمانے میں جو مرد جتنی زیادہ بیویاں پال سکتا تھا وہ اتنا ہی بڑا ''مرد'' سمجھا جاتا تھا۔ شاید اس لئے ہمارے شہنشاہوں نے، بادشاہوں نے، یہاں تک کہ چھوٹے موٹے نوابوں نے بھی اپنی مردانگی کو جگ ظاہر کرنے کے لئے سو پچاس بیگمات کو اپنے حرم میں قید کر رکھا تھا)۔ دادی ماں ہمیشہ میری ماتا جی کو ایک ڈائیلاگ مارا کرتی تھیں..... ''بہورانی! مرد کے دل کو راستہ اس کے پیٹ سے ہو کر جاتا ہے۔ اپنے پتی کے پیٹ کو شاد رکھو تو ہمیشہ آباد رہوگی ورنہ اگر ایک بار مرد کے منہ کو بازار کا کھانا لگ گیا تو گھر کا بدمزہ ہو جاتا ہے''۔ آج جب دادی ماں نہیں ہیں اور ہم ہماری مہارانی سے..... روز روز فریج میں رکھا ہوا ٹھنڈا گوشت کھا کھا کر تنگ آچکے ہیں تو ہمیں اُن کی باتوں کی گہرائی اور سچائی کا پتا چلا ہے۔ شاید اسی لئے دادا جی صرف اُن کے ہی پلو سے بندھے رہ گئے، کبھی کسی اور کے کھانے پر للچائی نظر نہیں ڈال سکے۔ اگر مرد گھر میں ہی شکم سیر ہو کر کھالے تو پھر مفت کا قورما بریانی بھی اس کی نیت کو ڈانواڈول نہیں کر سکتا۔

پیٹ کو پیٹ سے راہ ہوتی ہے۔ ایک پیٹ بکلا پیٹو..... اپنی ذات کے دوسرے پیٹو کا بہت خیال رکھتا ہے۔ کہیں شادی بیاہ کی دعوت ہو تو فون کر کے پہلے تصدیق کر لیتا ہے کہ دوسرا پیٹو بھی وہاں جا رہا ہے یا نہیں؟ اگر ہاں تو پھر دونوں ساتھ میں چلنے کا وقت مقرر کر لیتے

ہیں اور..... میزبان بیچارہ دونوں کو کھلاتے کھلاتے اُس کی بھوک سسک سسک کر مر جاتی ہے۔ ہمارے ایک دوست ہیں..... پی.کے. باٹلی والا۔ ارے نہیں بھئی..... یہ نام کے پی۔کے۔ ہیں اور نام کے ہی باٹلی والا۔ یہ نہ کچھ پیتے ہیں اور نہ کبھی کسی کو پلاتے ہیں۔ یہ جب کہیں دعوت میں جاتے ہیں تو..... صرف اور صرف کھاتے ہیں اور کھاتے ہیں..... پیتے کچھ بھی نہیں، یہاں تک کہ پانی بھی نہیں پیتے۔ کہتے ہیں کہ کھانا کھانے کی دعوت ہے، کھاؤنگا۔ پانی وغیرہ گھنٹہ بھر بعد کہیں سے بھی پی لونگا۔ کھاتے وقت اگر پانی پی لیا تو کھانے کی جگہ مر جائے گی پھر کھاؤنگا کیا؟ ہم ان کی اس عادت سے اُس دن واقف ہوئے جس دن وہ ہمارے غریب خانے میں تشریف لائے اور ہمارا پورا گھر..... اللہ جھوٹ نہ بلوائے..... اُس دن بھوکا رہ گیا تھا۔ خدا بچائے ایسے پیٹ بکلوں سے۔ آمین!

پیٹ کے معاملے میں مرد تو جو ہیں سو ہیں، عورتیں تو اُن سے میلوں آگے ہیں۔ یہ پیٹ کے اندر کھانا کم..... باتیں زیادہ بھرتی ہیں۔ یہ پیٹ کی اتنی کچی ہوتی ہیں کہ کبھی کوئی بھی بات پچا نہیں سکتیں، بدہضمی ہو جاتی ہے، اُگل دیتی ہیں۔ مگر ہائے رے بھوک..... جتنا اگلتی ہیں اتنا اور بھر لیتی ہیں۔ دو عورتیں ایک جگہ ہو جائیں تو گھر سے، ساس، سسر، دیور، نند اور پتی، بیٹے کی شکایت سے شروع کر کے پڑوسی اور پھر بھی دل نہیں بھرتا ہے تو اپنے میکے کی طرف مُڑ جاتی ہیں..... اور اپنی بھابی، مامی، چاچی کی پگلی کرنے لگتی ہیں۔ ایک بولتی جاتی ہے، دوسری اس کو کان کے رستے پیٹ میں بھرتی جاتی ہے اور درمیان میں..... چھوٹی بڑی آہیں..... اوہ..... آہ..... کر کے مزہ بھی لیتی ہے۔ جب اس کا پیٹ فُل ہو جاتا ہے تو پھر دوسری کو روک دیتی ہے اور خود شروع ہو جاتی ہے۔ دونوں بھرے پیٹ ایک دوسرے کو بائے کہتی ہیں اور..... دو چار قدم کے بعد اگر کوئی تیسری دوست مل جاتی ہے تو..... اُس کے سامنے ابھی ابھی پیٹ میں ڈالی ہوئی باتیں اُگل دیتی ہیں۔ آج تک کوئی ایسا علاج ایجاد نہیں ہوا جو عورت کے پیٹ میں پڑی ہوئی باتوں کو پچانے میں مدد کرے۔ اگر کوئی سائنس داں اس اور دھیان دیکر کامیاب ہو جائے تو میرا دعویٰ ہے کہ وہ سال بھر میں دنیا کا سب سے امیر آدمی بن سکتا ہے۔

پیٹ کے معاملے میں ہماری ہندی فلمی ہیروئنیں بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ پیٹ دکھانے کا فیشن شروع کیا ہمارے سلّو بھائی جان..... سلمان خان صاحب نے اور اسے لپک لیا ہماری ہیروئنوں نے۔ آپ دیکھیں گے کہ کوئی بھی گیت ہو، کلب ڈانس ہو، شادی بیاہ کا گانا ہو..... جنم دن کی پارٹی کا جشن ہو یا پھر بچے کو لوری سُنانے کا سین ہو..... ہماری مدھو بالائیں، ملیکا ئیں، میگھنا ئیں..... پیٹ دکھانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں۔ اب تو پیٹ پہ طرح طرح کے ڈیزائن بھی کاٹ لیتی ہیں..... ہے رام، اوم وغیرہ بھی لکھ لیا کرتی ہیں تا کہ کوئی پنڈت قسم کا آدمی نہ دیکھنا چاہے بھی تو مجبوراً دیکھے۔ کچھ ایک تو پیٹ کے بٹن کو ناک کی طرح چھیدوا لیتی ہیں اور کہتی ہیں! Its Rocks۔ پہلے کی فلمی ہیروئنیں گلے کے نیچے کا حصہ دکھانے میں شرماتی تھیں مگر آج..... حال یہ ہے کہ ہماری بالائیں پیٹ کے نیچے تک جا پہنچی ہیں۔ کوئی بھی ٹیلی ویژن چینل آن کریں، ریمکس گانے میں..... پیٹ کھلی لڑکیاں بندروں کی طرح اچھلتی کودتی اور کبھی کبھی ہیرو کے ساتھ پیٹ سے پیٹ ٹکراتی نظر آجائینگی۔ بھگوان جانے ہماری آنے والی پیڑھی..... جو ابھی سے پیٹ دیکھ دیکھ کر..... پیٹ کی ہلکی ہو چکی ہے، آگے چل کر کیسی ہوگی؟

کوئی ایک آدمی یا عورت..... کوئی ایک انسان..... وہ چاہے کسی ذات، مذہب یا قوم کا ہو، کہیں سے اُٹھے اور پیٹ کے خلاف آندولن کرے۔ جو مینکا جی، تو گڑیا جی، بخاری بھائی یا ٹھاکرے جی کی طرح..... ہمت والا ہو، دل جگر اور پیٹ والا ہو۔ جس کے پیٹ میں ہمارے دیس کی تہذیب وتمدن کا درد ہو۔ اور وہ پیٹ دکھاؤ سوسائٹی کے خلاف آواز اٹھائے، دھرنا دے، پردرشن کرے۔ بھارت بند یا چکّا جام کرے۔ مگر کچھ کرے، تا کہ آجکل ہمارے سماج میں جو پیٹ دکھاؤ فیشن چل نکلا ہے وہ بند ہو۔ اور ہماری آنے والی نسل پیٹ کے علاوہ بھی کچھ اور دیکھ سکے.....!!

☆☆☆

ہو جاتا ہے.....!!

کہتے ہیں پیار کیا نہیں جاتا، ہو جاتا ہے! مگر ہم تو اللہ جھوٹ نہ بلوائے، آج تک کسی ایسے عاشق یا معشوق سے نہیں ملے جسے پیار ہو گیا ہو۔ بلکہ ہم نے ہزاروں ایسے دیکھے، سُنے اور کچھ ایک کے چشم دید گواہ بھی ہیں کہ جنھوں نے پیار کیا ہے۔ اور کرنے سے پہلے پوری پوری پلاننگ بھی کی ہے کہ کیسے اپنے محبوب کی چشمِ الفت کا نشانہ بنا جائے، کس کس موڑ پہ اُس سے ٹکرایا جائے، کیسے اس سنگِ دل کو موم کیا جائے، کس طرح اُس کو امپریس کیا جائے؟ اور پھر اُسے اپنے دام میں پھانسا جائے۔ یہ بات صرف مرد عاشقوں پہ لاگو نہیں ہوتی ہے بلکہ چند ایک صنفِ نازک، پردہ نشیں، ماہ جبیں بھی اس طرح پیار کرتی ہیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی سلامت رہے (اور یہ لاٹھی شادی کے بعد کام آئے!)۔

تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ پیار ہوتا نہیں ہے، سلکہ پوری منصوبہ بندی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اور آج کل کا پیار..... اللہ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، رومیو جولیٹ کی روحوں کو سکون بخشے کہ اگر وہ لوگ آج کے دور کا پیار دیکھ لیتے تو بدہضمی سے مر جاتے۔ آج کل کا پیار اخبار و رسائل کی طرح ہفتہ وار، پندرہ روزہ، مہینہ وار ہوتا ہے۔ اور اگر بہت زیادہ گہرا اور سچا پیار ہوا تو سالانہ بھی ہو جاتا ہے، ورنہ اُردو سہ ماہی کی طرح یہ پیار..... تین مہینے میں دِل بدل لیتا ہے اور عاشق..... دَل بدل لیتے ہیں۔ پیار کرنے والوں کی اور پیار پانے والوں کی تعداد میں روز بروز بھاری اضافہ ہو رہا ہے اور وہ دن بہت دور نہیں جب ہمارے ملک میں پیار سے خالی کوئی دِل نہیں ہوگا (سیاسی دَل کو چھوڑ کر!)۔

پیار..... یہ چھوٹا سا لفظ، بڑا فتنہ پرور ہے۔ یہی ہے وہ جس نے ہمارے باوا آدم کو جنت بدر کیا ورنہ ہم آج ہندوستان میں نہیں جنت میں ہوتے..... جہاں نہ پیٹ ہوتا نہ بھوک اور ہم حرام خوری سے بچے رہتے۔ دن رات اُس کی عبادت میں لگے رہتے جس کے قبضے میں

ہماری جان ہے۔ مگر آج ہماری جان کسی بُتِ کافر کے قبضے میں ہوتی ہے۔ کیا کریں اسی پیار نے ہمارے بابا آدم کو مجبور کیا اور وراثت میں ہمیں ملی، ہمیں بھی مجبور کیا۔ ہم نے بھی پیار کیا۔ ایک دو نہیں کئی کئی بار کیا مگر ہر بار..... بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے!

پیار..... تین طرح کا ہوتا ہے۔ بالی عمر کا پیار، جوانی کا پیار اور بُڈھاپے کا پیار۔ اگلے پچھلے پیار سے ہمیں اور آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہوگی کیونکہ..... بچپن کے پیار اور بڑھاپے کے پیار میں بس..... بال برابر فرق ہوتا ہے۔ دونوں کے symptoms ایک جیسے ہوتے ہیں اور دونوں کا نتیجہ بھی ایک جیسا ہوتا ہے۔ بس ایک ہی قابل ذکر فرق ہوتا ہے اور وہ ہے بال کا..... بالی عمر کے پیار میں بال کالے اور بڑھاپے کے پیار میں سفید ہوتے ہیں۔

ہم جوانی کے پیار کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہ پیار بھی تین طرح کا ہوتا ہے۔ نوجوانی کا پیار (۱۴ تا ۲۰ سال)، بھری جوانی کا پیار (۲۰ تا ۳۰ سال) اور ادھیڑ عمر کا پیار..... جسے ہم تھرٹی پلس (30 Plus) پیار بھی کہتے ہیں۔ اوّل الذکر دونوں پیار کے کرامات اور خرافات کے بارے میں آپ اور ہم راہ چلتے، بازار میں، گلیوں میں، پارک میں، اسکول اور کالجوں میں اور تو اور..... اکثر اخبار و رسائل میں بھی روز پڑھتے رہتے ہیں مگر آخر الذکر پیار..... یعنی کہ تھرٹی پلس پیار کے بارے میں اکثر و بیشتر کانوں سُنی باتیں ہی سُننے کو ملتی ہیں کیونکہ اس ٹائپ کا پیار کرنے والے بڑے گھاگ ہوتے ہیں۔ اتنے شاطر کہ خدا بھی سوچتا ہوگا کہ..... کاہے کو پیار بنائی!

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ہمارے بڑے بابو..... جو ہمیشہ آفس لیٹ آتے ہیں، ایک گھنٹہ پہلے ہی آفس آ گئے۔ ہم لوگ آفس میں اپنا اپنا کام چھوڑ کر مس رمبھا کی میز کے پاس نکّو سجائے بیٹھے تھے اور وہ اٹھلاتی، دیدے مٹکاتی اپنے کیرالا کی، وہاں کے لوگوں کے بھائی چارے کی کہانی..... نمک مرچ لگا کر ہمارے سامنے پیش کر رہی تھی۔ ابھی صرف گیارہ بجے تھے اور بڑے بابو کے آنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا، اسلئے ہمیں کوئی فکر نہیں تھی۔ مگر بڑے بابو اچانک نازل ہو گئے۔ انکے چہرے کی لالی دیکھ کر مجھے لگا کہ سیدھے بیوٹی پارلر سے آ رہے

میرا قاری میری شاعری پڑھنے کے بعد، غریب و مظلوم لوگوں کی دادرسی کے لئے سینہ سپر ہو جائے، ان کے حق کے لئے لڑنے مرنے کو تیار ہو جائے۔ غرض کہ میں بھی ہر ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر کی طرح اپنے دور کا غالبؔ و میرؔ نہ سہی..... فیضؔ یا فرازؔ بننے کا خواب..... دن میں آنکھ کھولے دیکھ رہا تھا مگر.....

چند سال بعد یہ احساس ہوا کہ اردو ادب میں غزل کا بول بالا ہے اور ہر ماہ ہزاروں کی تعداد میں غزلیں لکھی جا رہی ہیں مگر بے سود! تب مناظر بھائی (ڈاکٹر مناظر عاشقؔ ہرگانوی صاحب) نے مجھے مشورہ دیا کہ..... ''منیرؔ! مجھے تم میں وہ ساری صلاحیتیں نظر آ رہی ہیں جو ایک اچھے انشائیہ نگار میں ہونی چاہئیں۔ اگر تم اس طرف دھیان دو اور ایمانداری سے کوشش کرو تو بہت جلد اپنا مقام بنا سکو گے''۔ اور میں نے ان کی بات مان لی اور جو پہلا انشائیہ لکھا وہ ''شاعر'' میں شائع ہوا، کافی پذیرائی ہوئی۔ اس کے بعد اردو کے ہر اُس جریدے میں شائع ہوا جہاں طنز و مزاح کو ادب کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے، بیکار کی بات یا..... دل بہلانے کا سامان نہیں!

انٹرنیٹ نے دنیا کو ایک گلوبل ویلج بنا دیا ہے۔ دنیا اب انگلیوں کی ہلکی سی جنبش، ماوز کی ایک کلک میں سما گئی ہے۔ کروڑوں کی تعداد میں ویب سائٹز ہر لمحہ آپ کی نظر کرم کی محتاج رہتی ہیں۔ زندگی کے کسی بھی شعبے کے بارے میں کسی بھی طرح کی جانکاری چاہئے..... انٹرنیٹ حاضر ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اردو زبان و ادب کے شیدائی یہاں بھی کم نہیں ہیں۔ انٹرنیٹ پر اردو کے کئی فورمز، رسالے، میگزین وغیرہ بڑی آن بان و شان کے ساتھ زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ میں بھی کئی ایک فورمز جیسے .....اردو بندھن، اردو انجمن، اردو گلبن، اردو پائینٹ، اردو پوئٹری، شعر و سخن، اپنا جلالپور جٹن، ہمدم وغیرہم کا مستقل ممبر ہوں اور میری شاعری، طنز و مزاح، انشائیے، افسانچے وغیرہ یہاں کافی مقبول بھی ہیں۔ بیشتر دوستوں کی فرمائش تھی کہ مجھے اپنے انشائیوں کا مجموعہ شائع کرنا چاہئے۔ سال بھر سے سوچ رہا تھا کہ کیا کروں؟ مجموعہ شائع کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے مگر..... پڑھے گا کون؟؟ آج کل اردو

ہیں مگر جب مِس رمبھا (انکی پی۔اے) انکے چیمبر سے ایک گھنٹے بعد نکلی اور لنچ میں رو رو کر ہمیں اس نے تفصیل بتائی تب اصل واقعہ کا علم ہوا کہ آخر بڑے بابو کا چہرہ اتنا سندوری کیوں لگ رہا تھا؟ ہوا یوں کہ..... ہمارے بڑے بابو ہیں چالیس بیالیس سال کے..... دو چار سال ادھر ادھر بھی ہوسکتا ہے کہ امیر آدمی ہیں، عمر چھپانے کی ہزاروں مہنگی دوائیاں بازار میں ملتی ہیں۔ کھاتے پیتے گھرانے کے ہیں اس لئے پینتیس سے زیادہ کے نہیں لگتے۔ اکلوتی اولاد تھے تو ماں باپ نے جلدی شادی کردی۔ ایک جوان بیٹی بھی ہے جو کالج میں پڑھتی ہے اور کالج کی بیوٹی کوئن بھی ہے مگر مجال ہے جو دونوں کو ساتھ دیکھ کر کوئی کہہ دے کہ باپ بیٹی ہیں.....! مگر بڑے بابو کی بیوی..... بیچاری گھر کی مُرغی..... بیس سال کی شادی شدہ زندگی گزار کر باسی روٹی کی طرح سکوکر..... ساٹھ سال کے اوپر کی چیز لگتی ہیں۔ ایسے میں ہمارے بڑے بابو اگر ادھر اُدھر چکن بریانی کھالیتے ہونگے تو اس میں انکا کیا قصور؟ ہم تو سمجھے تھے کہ انہوں نے مِس رمبھا کو اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے، کیونکہ انہوں نے اپنے پتاجی کے بعد آفس جوائن کرتے ہی جو سب سے پہلا کام کیا وہ تھا..... شادی شدہ اور دو بچوں کی ماں مسز نرمدا کو ولنٹری ریٹائرمنٹ کا لالچ دیکر آفس سے باہر نکالنا..... اور ان کی جگہ تقریباً سو سے زیادہ کنواری، سڈول اور سیکسی لڑکیوں کا انٹرویو لیکر..... آخر میں مِس رمبھا جیسی نمکین، بھرے بھرے بدن کی بولڈ لڑکی کو اپنی پرائیوٹ سکریٹری بنانا۔ ہم سب بھی بہت خوش تھے کہ چلو..... مسز نرمدا جیسی کھوسٹ سے پالا چھوٹا۔ اب آفس کی شروعات ساوتھ سینسیشن مِس رمبھا کی دلفریب مُسکراہٹ سے ہوگی تو دن بھر کام میں جی لگا رہے گا اور اگر اللہ نے چاہا تو بڑے بابو کی غیر حاضری میں چانس بھی لگ سکتا ہے۔ اسی چانس کے چکر میں ہم سب تھرٹی پلس کولیگ ایک دوسرے کی چُغلی مِس رمبھا سے کرتے رہتے تھے مگر وہ خدا کی بندی آج تک ادھر کی بات اُدھر نہیں کی ورنہ..... آفس میں کب کا خون خرابہ ہو چکا ہوتا۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ اس دن بڑے بابو کا چہرہ ضرورت سے زیادہ لال کیوں تھا؟ بقول مس رمبھا..... اُس دن بڑے بابو کو اُس عورت کے جوان بیٹے نے رنگے ہاتھوں

پکڑ لیا تھا جس کے ساتھ بڑے بابو ہوٹل میں اپنی فیملی پرابلیم ڈسکس کر رہے تھے۔ جوان بیٹا اپنی ماں کی بے راہ روی کو نظر انداز کر کے بڑے بابو پر نظرِ کرم کر گیا۔ یکے بعد دیگر..... اتنے تھپڑ لگائے اُس نے کہ بڑے بابو کو سانس لینے کا موقع بھی مشکل سے ملا اور وہ وہاں سے دُم کٹے کتے کی طرح چھلانگ لگا کر اپنی کار تک پہنچے اور اتنی تیز رفتار سے آئے کہ اگر فرمولا وان موٹر ریشنگ میں ہوتے تو مائکل سُوما کر بھی شرم سے پانی پانی ہو جاتا۔ مگر ہمارے بڑے بابو اتنے بے شرم ہوں گے، یہ مجھے اندازہ نہیں تھا۔ وہاں سے سیدھے آفس آئے اور دو بوتل کولڈ ڈرینکس پی کر مِس رمبھا کی مخملی آغوش میں مُنھ چُھپا کر ندامت کے آنسو ٹپکانے لگے۔ جب مِس رمبھا نے اپنے پرائیوٹ طریقے سے پُچکارا اور پوچھا کہ معاملہ کیا ہے تو بڑے بابو سب اُگل بیٹھے۔ اب آنسو بہانے کی باری تھی مِس رمبھا کی۔ وہ بیچاری یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ بڑے بابو کی زندگی میں صرف وہی ایک باہر والی ہے جو گھر والی کا رول کر رہی ہے مگر اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ تھرٹی پلس کے امیر لوگ..... لڑکیوں کو طرح طرح کی آئس کریم سمجھتے ہیں، جو صرف زبان کا ذائقہ بدلنے کے لئے ہوتی ہیں ورنہ اصل لنچ یا ڈنر تو وہ گھر پہ ہی لے لیتے ہیں، کیونکہ جوان بچوں کی ماں خود کمزور ہو کے بھی..... اُنکے لئے بہت بھاری پڑتی ہے!

ایسا نہیں ہے کہ یہ تھرٹی پلس پیار صرف مرد لوگ ہی کرتے ہیں۔ بلکہ، خدا جھوٹ نہ بلوائے..... حوا کی بیٹیاں تو اس معاملے میں مردوں سے دو چار ہاتھ نہیں بلکہ دو چار کیلومیٹر آگے ہیں۔ ہمارے میٹروشہر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کلاس ون آفیسرز کی الٹرا موڈرن مسز (انہیں بیوی کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے) کے چکّروں کی باتیں سُن، پڑھ اور دیکھ کر ہی دماغ چکرا جاتا ہے۔ اور انکے فراخ دل ہزبینڈ لوگ (پتہ نہیں شوہر کو انگریزی میں ہزبینڈ کیوں کہتے ہیں، جو حقیقت میں شادی کے بعد بینڈ ہی ہو کر رہ جاتا ہے)..... اپنی اپنی مسز کے بوائے فرینڈ سے اتنا ٹوٹ کر ملتے ہیں جیسے وہ انکا اپنا بھائی ہی ہو، جو لکشمن کی طرح انکی غیر موجودگی میں اپنی ماں جیسی بھابی کا خیال رکھتا ہو۔ وہ بیچارے کریں بھی تو کیا کریں..... خود تو رام نہیں شیام ہیں..... گھر سے باہر گل چھرّے اُڑاتے رہتے ہیں، ایسے میں انکی بیوی کی خبر گیری اگر کوئی جینٹل مین رکھتا ہو تو اسکا شکریہ تو..... ادا کرنا ہی پڑیگا نا؟

شہر تو شہر..... اب ہمارے گاؤں کی گوپیاں بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ ہمارے گھر سے دو گھر چھوڑ جو تیسرا گھر ہے، وہ ہے ہمارے رحیمو چاچا کا۔ بچپن میں وہ ہم سب کے چہیتے چاچا تھے۔ شہر کے کسی کپڑا مل میں نوکری کرتے تھے۔ جب بھی گاؤں آتے تھے، سب سے پہلے ہمارے گھر آتے تھے۔ ماں کے لئے کچھ نہ کچھ لاتے تھے اور میرے لئے..... بہت کچھ! سُنا ہے کہ میرے پتاجی کے بہت اچھے دوستوں میں سے تھے اور انکے مرنے کے بعد میری پڑھائی کا سارا بھار رحیمو چاچا ہی اٹھاتے تھے۔ ایسی بات نہیں تھی کہ انکی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اللہ نے انہیں پانچ بچوں سے نوازا تھا۔ سُنا ہے وہ سال میں ایک آدھ بار پندرہ بیس دن کے لئے گھر آتے ہیں اور دُلاری چاچی کو خوش کر کے چلے جاتے ہیں۔ انکی مجبوری یہ تھی کہ وہ چاچی اور بچوں کو اپنے پاس بُلا نہیں سکتے ورنہ انکی اندھی ماں کا دھیان کون رکھتا؟ ایسے میں اگر دُلاری چاچی..... بچوں کے ٹیوشن ماسٹر کے ساتھ گھر سے بھاگ جاتی ہے تو اس میں اُس بیچاری کا کیا قصور؟ ضرورت ایجاد کی ماں ہے اور تھرٹی پلس پیار کے لئے تو انسان کچھ بھی کر جاتا ہے۔ ہوس کی آگ جب رفتار پکڑ لیتی ہے تو پھر دُنیا کا کوئی رشتہ سلامت نہیں رہتا..... سب جل کے راکھ ہو جاتا ہے!

پیار ہو ہی جاتا ہے اگر ڈھنگ سے کیا جائے! اب مجھے ہی دیکھئے۔ جب گاؤں میں تھا تو نہ جانے کتنی خالہ زاد، ماموں زاد، پھوپی زاد اور پڑوسی زاد بہنوں کے دل کا چین اور من کا میت تھا۔ ابھی صرف پانچ سال ہی ہوئے ہیں مجھے شہر آئے ہوئے مگر ایسا لگتا ہے پانچ صدیاں گزار چکا ہوں۔ اگروال صاحب میرے مکان مالک ہیں۔ انکی پلس ٹو میں پڑھنے والی بیٹی کو پولیٹیکل سائنس پڑھا دیتا ہوں تو میرے لئے کھانا ان کے گھر سے آجاتا ہے۔ اب یہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ میں اُسے پولیٹیکل سائنس پڑھاتا ہوں یا اُسکے جغرافیہ میں اُلجھا رہتا ہوں۔ اللہ جھوٹ نہ بُلوائے..... وہ مجھے نوازتی رہتی ہے، صرف میرے کپڑے ہی پریس نہیں کر دیتی بلکہ مجھے اچھے اچھے کپڑے بھی سِلوا دیتی ہے۔ میں اُسکا پہلا پیار جو ہوں اور وہ میری..... پتا نہیں؟! آفس میں مِس رمبھا کو کب سے لائن مانگ رہا ہوں مگر وہ ہمیشہ.....

''یو آر اے نوٹی فیلو'' (You are a naughty fellow) کہہ کر نظر انداز کر دیتی ہے۔ وہ کرے بھی تو کیا، جب بڑے بابو اسکے ٹارگٹ ہوں تو ہم جیسے کولیگ..... کس کھیت کی مولی ہیں! مگر اب لگتا ہے کہ میری دال گلنے والی ہے۔ اب جبکہ مِس رمبھا کے سپنوں کا محل بڑے بابو نے توڑ دیا ہے تو ایسے میں اُس کو سرٹکا کے رونے کے لئے ایک مضبوط کندھے کی ضرورت پڑیگی اور..... پورے آفس میں ایک اکیلا کنوارہ میں ہی ہوں، جس کے پاس دو مضبوط کندھے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اب مجھے پیار کر ہی لینا چاہیئے ورنہ مِس رمبھا کو کسی اور سے..... ہو جائیگا!!

☆☆☆

جدید لب و لہجے کا بے باک شاعر

منیر ارمان نسیمی کا

اولین شعری مجموعہ

''میں سورج کا چہرہ ہوں''

[اردو اور ہندی رسم الخط میں]

ملٹی کلر سرورق، ۱۲۸ صفحات، قیمت: ۱۰۰ روپے

رابطہ

روزن پبلی کیشن

سرکارنگر، بھدرک-۷۵۶۱۰۰ (اڑیسہ) انڈیا

بابا رے بابا

آج سے تقریباً پچیس سال پہلے، ہندوستان کے مشہور میگزین 'السٹریٹڈ ویکلی' نے ایک سروے کیا تھا کہ اُس وقت ہندوستان میں، چھوٹے بڑے ملا کر کم وبیش پچاس ہزار بابا باحیات ہیں۔ اگر ہم شرح آبادی کے حساب سے دیکھیں تو آج ہندوستان میں باباؤں کی تعداد کم از کم پانچ لاکھ تو ضرور ہوگی۔ اس سے زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔ آج کل بابا روگ..... ایڈز سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے پھیل رہا ہے۔ باباؤں کی تعداد میں دن بہ دن بھاری اضافے کو دیکھ کر ہمارا دل گدگد ہو جاتا ہے کہ چلو وہ دن دور نہیں جب ہمارے ملک میں 'رام راجیہ' ہوگا۔ اگر ہر بابا اپنے چاہنے والوں کو نیکی، بھلائی، بھائی چارگی اور امن وسکون کا پاٹھ پڑھا دینگے تو..... ہمارا ملک فرقہ پرستی اور ذات پات کے جھگڑوں سے پاک وصاف ہو جائیگا۔ ہر طرف سُکھ اور شانتی ہوگی، تب ہم بہ بانگِ دہل یہ گاتے پھرینگے..... سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا.....!!

ہندو پاک میں..... جہالت اور ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے باباؤں کی چاندی ہو رہی ہے۔ جاہل عوام..... اللہ اور بھگوان سے کم ان باباؤں سے زیادہ ڈرتی ہے۔ جتنی محبت ان باباؤں سے کرتے ہیں اگر خدا سے کرتے تو شاید ولی ہو جاتے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ باباؤں میں سب کے سب پاکھنڈی ہوتے ہیں۔ آج بھی کچھ بابا ایسے ہیں جو سچ مچ اللہ سے لو لگائے ہوئے ہیں، بھگوان کا نام جپتے ہوئے ان کے منھ نہیں تھکتے۔ جو عوام سے، نام ونمود سے، عیش وعشرت سے دور بھاگتے ہیں۔ اپنی دُھن میں مست رَب کا نام لیتے ہیں اور تمام دنیا کے لئے دعائیں کرتے رہتے ہیں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہمارے ملک میں پاکھنڈی باباؤں کی بھرمار ہے۔ کوئی بھی ایسا شہر، قصبہ، گاؤں یا گلی نہیں ہے جہاں دو چار خود ساختہ..... چمتکاری بابا نہیں ہیں، بھلے

وہاں مسجد نہ ہو مندر نہ ہو مگر بابا کا ایک آدھ آشرم ضرور ہوگا۔ آئے دن اخباروں میں، ٹی وی پر ان پاکھنڈی باباؤں کی کالی کرتوتوں کا بھانڈا پھوٹتا رہتا ہے مگر واہ رے بھولی عوام، پڑھ کر بھولنے کا مرض انہیں ہے! میرے حساب سے ان پاکھنڈی باباؤں کی چار قسمیں ہوتی ہیں بھیک منگے بابا، لفنگے بابا، بھوگی بابا اور..... یوگی بابا۔

سب سے پہلے بھیک منگے باباؤں کا ذکر کرینگے۔ گلی گلی دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگنے والے کو ہم بھیک منگے بابا کہتے ہیں مگر.....ان بھیک منگے باباؤں میں بھی دو قسم ہوتی ہے۔ ایک وہ جو مجبور ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو کام چور ہوتے ہیں۔ مجبور بھیک منگے بابا وہ لوگ ہوتے ہیں.....جنھیں بھگوان پچھلے جنم کے پاپوں کی سزا کے طور پر لُولا، لنگڑا، کانا یا بہرا پیدا کرتا ہے، جو کسی طرح کے کام نہیں کر سکتے سوائے مانگنے کے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ہر معذور بھیک منگا ہوتا ہے۔ میں ذاتی طور پر ایسے اندھوں سے ملا ہوں جو تجارت کر رہے ہیں (میرا یقین کریں ایک ایسے اندھے صاحب سے بھی ملا ہوں جو چلتی ٹرین میں کتابیں فروخت کرتے ہیں۔ ایسے لنگڑوں سے ملا ہوں جو اپنی وہیل چیئر میں بیٹھ کر میلوں دور سیلس مین کا کام کر رہے ہیں اور اپنی فیملی کو پال رہے ہیں۔ ان لوگوں سے مل کر دل کو نئی امنگ ملتی ہے، ایک نیا جوش پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ لوگ کر سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں۔ زندگی کو ڈھونے کا ایک نیا بہانہ مل جاتا ہے۔ خیر یہ ایک الگ قصہ ہے جو پھر کبھی سناؤں گا)۔ بات ہو رہی تھی ان مجبور لوگوں کی جو اپنی معزوری کو اپنا ہتھیار بنا لیتے ہیں اور بھگوان کا بدلہ انسان سے لیتے ہیں.....کوئی کام دام نہیں کرتے، پیٹ کا کنواں بھرنے کے لئے بھیک کا دانا ڈالتے رہتے ہیں۔ اس کے لئے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے میں انہیں شرم نہیں آتی۔ بڑے بوڑھے تو دور یہ بے شرم لوگ اسکولی بچوں کے سامنے بھی ہاتھ پھیلا دیتے ہیں'' بھگوان کے نام پہ دیدے بچہ.....جو کچھ بھی مانگے کا پائیگا''۔ ایک معصوم بچے نے ڈر کے پاکٹ منی کا پانچ روپیہ ڈال دیا۔ بابا خوش ہو گئے اور بچے کو خوش کرنے کے لئے بولے.....'' مانگ کیا مانگتا ہے بچہ؟''۔ ''میرے پانچ روپئے واپس کر دیجئے''.....بچہ معصومیت سے بولا۔

ہم بھی ایسے بھیک منگے باباؤں کی تعداد میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ یہ لوگ جب ہاتھ پھیلاتے ہیں تو ہم میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنے پاپ کے بوجھ کو کم کرنے کے لئے..... ان کو روپیہ، دو روپیہ دان کر دیتے ہیں اور دل ہی دل میں ایسے خوش ہوتے ہیں جیسے اپنے اعمال نامے کی سلیٹ سے پاپ کے حساب کو پوچھ کر مٹا دیا ہو۔ پھر دوسرے دن سے اسی جھوٹ، دغا، فریب میں لگ جاتے ہیں۔

بھیک منگے باباؤں کی دوسری قسم ہوتی ہے کام چوروں کی۔ آپ لوگوں نے اپنے شہر میں، بازاروں میں، گلیوں میں ان کام چور باباؤں کی ٹیم کو گشت کرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ یہ لوگ پیدائشی کام چور ہوتے ہیں۔ ماں باپ کے سینے پر مونگ دل کے جوان ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہی داڑھی، مونچھیں آجاتی ہیں یہ آزاد ہوتے ہیں۔ رعب دار مونچھیں، لمبے بال اور داڑھی کے ساتھ بڑا پراثر چہرہ بنا لیتے ہیں اور بابا بن جاتے ہیں۔ بھیک منگے اور کام چور تو ہوتے ہی ہیں مگر بڑے شاطر ہوتے ہیں۔ جیسا دیس ویسا بھیس کی پالیسی ہوتی ہے ان کی۔ اگر کسی ہندو علاقے میں جاتے ہیں تو گیروا وستر دھارن کر لیتے ہیں، سرخ لمبا سا تلک لگا لیتے ہیں اور..... جے شری رام..... جے بجرنگ بلی..... اور ہر ہر مہادیو کا نعرہ لگاتے ہیں اور اگر کسی مسلم اکثریت والے علاقے میں نکل جاتے ہیں تو..... سبز رنگ کے پوشاک کے ساتھ کسی بزرگ کے مزار سے چوری کی ہوئی چادر ڈال لیتے ہیں، سر پہ بڑا سا عمامہ، آنکھوں میں سُرمہ لگائے..... حق اللہ اور اللہ ہو کا نعرہ اتنی زور سے لگاتے ہیں کہ بچے اور بوڑھے کی بات کیا..... قبر کے مُردے بھی کروٹ بدل لیتے ہونگے۔ ایسے میں سامنے کھڑا بھولا بھالا انسان اگر ڈر کے مارے دس بیس روپیہ نکال کر ان کے ہاتھ دھر دے تو ہمیں تعجب نہیں کرنا چاہیئے۔ دن بھر میں یہ بھیک منگے بابا کم و بیش سو دو سو تو ضرور کما لیتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ کما لیتے ہونگے۔ دوپہر کا لنچ..... کسی اللہ ورسول سے ڈرنے والے انسان سے وصول کر لیتے ہیں۔ پوری ٹیم رات کو ایک جگہ جمع ہوتی ہے۔ دن بھر خیرات میں کمائی گئی دال، چاول اور مُرغ کا حساب ہوتا ہے۔ پھر سب کو لے جا کر کسی ہوٹل والے کو بیچ دیتے ہیں اور وہاں سے بھر پیٹ ڈنر کر کے

واپس ہوتے ہیں..... شراب کی بوتل گھونٹ گھونٹ گلے سے اتارتے ہیں اور چرس کا چلم نکال کر..... کش پہ کش لگاتے ہیں اور اگلے دن کی پلاننگ کرتے ہیں۔

کچھ ایک بھیک منگے بابا ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے گلے میں ڈراؤنے جانوروں کو ڈالے پھرتے ہیں..... خاص طور سے اژدہا۔ جو حالانکہ بے ضرر ہوتا ہے مگر..... دیکھنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اکیلے میں اگر کوئی انسان مل گیا تو سانپ کا ڈر دکھا کر اسے لوٹ لیتے ہیں..... خاص کر آفس سے لوٹ رہی عورتوں کو کسی سنسان جگہ پر گھیر لیتے ہیں۔ بیچاری عورت اتنے موٹے سانپ سے ڈر جاتی ہے۔ پورا بیگ خالی کر دیتی ہے، یہاں تک کہ پہنے ہوئے زیور بھی اتروا لیتے ہیں۔ کئی ایک جگہوں پر تو عورتوں کے ساتھ بدتمیزی بھی کر جاتے ہیں یہ بھیک منگے کام چور بابا۔ گاؤں تو گاؤں ہے..... دہلی جیسے شہر میں بھی اس طرح کے کئی حادثے ہو چکے ہیں۔

سب باباؤں میں سے سب سے زیادہ بدذات ہوتے ہیں..... لفنگے بابا، جنھیں میں بازاری بابا کہتا ہوں۔ آپ انھیں ''بازار کا کتا'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ گوشت مارکیٹ اور مچھلی مارکیٹ کے سامنے کتوں کی ایک بھیڑ..... آپس میں لڑتی جھگڑتی رہتی ہے۔ یہ بازاری کتے ہمیشہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ دکاندار کی نظر ذرا سی ادھر ادھر ہو اور وہ جھپٹ کر ایک موچہ گوشت اٹھا لے جائیں۔ بالکل اسی طرح ہمارے بازاری بابا بھی بڑے گوشت خور ہوتے ہیں۔ ہمیشہ ماتا جی کی تاک میں رہتے ہیں۔ یہ راون کی اولاد ہوتے ہیں اور کل یگ کی سیتاؤں کو بہلا پھسلا کر لوٹ لیتے ہیں۔ اور دکھ تو اس بات کا ہے کہ ہماری موڈرن سیتائیں بھی سب جان بوجھ کر..... کبھی امتحان میں اچھے نمبروں کے لئے..... کبھی اپنے پریمی کو پانے کے لئے..... کبھی اپنے پتی کو اپنے بس میں کرنے کے لئے..... ان لفنگے باباؤں کی شرن میں آتی ہیں اور بابا ان کا سب کچھ ہرن کر لیتے ہیں۔ تب ان بیوقوف ناریوں کو سوائے چُپ رہنے کے اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ جو تھوڑی شرم وحیا والی ہوتی ہے وہ موت کا راستہ چُن لیتی ہے مگر بابا کا کیا جاتا ہے۔ ان کے پاس بھکتوں کی کمی نہیں ہوتی۔ سب سے

زیادہ بھیڑ ان عورتوں کی ہوتی ہے جو کسی وجہ سے ماں نہیں بن پاتی ہیں۔ اولاد پانے کے لئے عورت کچھ بھی کر سکتی ہے..... کسی بھی حد تک گر سکتی ہے۔ یہ بات ان بازاری باباؤں کو اچھی طرح معلوم ہے اور وہ اسی کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان عورتوں کی دولت اور جسم سے جی بھر کے کھیلتے ہیں۔ اولاد کی پیاسی ماں..... پاپی بابا کی پیاس بجھاتی رہتی ہے۔ اگر اتفاق سے کسی نامرد کی بیوی کو باباجی سے گربھ رہ گیا تو..... وہ کم عقل عورت اس کو باباجی کا چمتکار سمجھ لیتی ہے اور اپنے علاقے سے کچھ اور عورتوں کو بابا کے شرن میں لے آتی ہے۔ اور ایک بات بتاؤں..... ان بازاری باباؤں نے چند حرافہ عورتوں کو پال رکھا ہے جو زائرین کی صورت بھیڑ میں شامل ہوتی ہیں اور باباجی کے چمتکار کی اتنی تعریف کرتی ہیں کہ وہاں آئی دوسری عورت ..... بابا سے ملے بغیر ان کی داسی بن چکی ہوتی ہے۔ جب بابا سے آمنا سامنا ہوتا ہے تو پھر جو بابا کہتے ہیں وہ ہاں میں ہاں ملاتی رہتی ہے۔

آج کل ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جہاں علم و ہنر والے اور جاہلوں میں کوئی فرق نہیں رہ گیا ہے۔ جاہل وزیروں کے زیر سایہ کام کرنے والے بیوروکراٹ خود کو ان سے آرڈر لیتے ہوئے کیسا محسوس کرتے ہونگے، یہ بات وہی بہ خوبی سمجھتا ہوگا جس نے خود بھگتا ہو۔ ہماری عوام 'چمتکار کو نمسکار' کرتی ہے۔ ہر آدمی سورگ میں جانا چاہتا ہے مگر مرنا کوئی نہیں چاہتا۔ ہر کوئی اس فراق میں ہے کہ بنا کچھ کئے اسے سب کچھ مل جائے۔ ہماری اسی ہوس کو اور بھڑکاتے ہیں ٹی وی پر آنے والے..... کون بنے گا کروڑ پتی، جیتو چھپر پھاڑ کے، ڈیل یا نو ڈیل، کم یا زیادہ اور ڈائل وان جیسے پروگرامس۔

زمانہ یکدم اشتہاری ہو چکا ہے۔ اصلی چیز چاہے کتنی اچھی کیوں نہ ہو بنا اشتہار کے بک نہیں سکتی۔ باتھ روم سے لے کر بیڈ روم تک کے سامانوں کا اشتہار اتنے چمک دمک اور انوکھے (اور کبھی کبھی بے ہودہ) طریقے سے دکھاتے ہیں کہ بچوں کو سبق یاد نہیں ہوتے مگر اشتہاری ڈائیلاگ یاد ہو جاتے ہیں۔ اشتہاری زمانے میں ہمارے باباؤں کی بھی نکل پڑی ہے۔ آئے دن اخباروں میں..... میگزین میں..... ٹی وی پر طرح طرح کے..... بنگالی بابا،

چھومنتر بابا، لنگوٹی بابا، مال پانی بابا، بکرا والے بابا، بندر والے بابا، طوطا والے بابا وغیرہ کا اشتہار دیکھ کر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے اور یہ سوچ کر دل دہل جاتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب سیکسی بابا، کنڈوم بابا، ایڈز والے بابا کا بھی اشتہار آئیگا۔

اشتہاری زمانے میں..... سب سے زیادہ فائدہ ہمارے بھوگی باباؤں کا ہوا ہے۔ جنھیں ہم اشتہاری بابا کہیں گے۔ سب باباؤں میں سب سے زیادہ شاطر اور عیار ہوتے ہیں یہ اشتہاری بابا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہائی ٹیک ہوتے ہیں، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ فرینڈلی ہوتے ہیں اور انگریزی کے ساتھ کچھ اور غیر ملکی زبانیں فراٹے کے ساتھ بولتے ہیں۔ کئی ایک اشتہاری باباؤں کی ساکھ ملک میں ہی نہیں بیرون ممالک میں بھی ہے۔ بیرون ممالک میں، خاص کر یوروپین دیسوں میں ان کے آشرم یا آفس بھی ہیں جنھیں منظم طریقے سے چلایا جارہا ہے۔ بابا کی غیر حاضری میں ان کے خاص چیلے یا چہیتی چیلی..... جو کہ اکثر گوری چمڑی والے ہوتے ہیں..... آشرم کو کنٹرول کرتے ہیں۔ یہ چیلے چیلیاں بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوتے ہیں۔ بھکتوں کو لوٹنے کے..... ہزاروں نسخے ایجاد کرتے ہیں۔ یہ بھوگی بابا یا اشتہاری بابا..... ہمیشہ اپنے سنگ دو چار پردیسی بلبل کو لئے پھرتے ہیں۔ ویسے بھی ہمارے دیس کی عوام گوری چمڑی والے انگریزوں سے کافی متاثر رہتی ہے، احساس کمتری میں رہتی ہے۔ جب عوام یہ دیکھتے ہیں کہ بابا کے ساتھ انگریز عورتیں اپنا گھر بار چھوڑ کر..... خدمت گزار بن گئی ہیں تو دل ہی دل میں بابا کی مہیما کے گن گاتے ہیں کہ..... ضرور بابا میں کوئی چمتکاری شکتی ہے ورنہ اتنی پڑھی لکھی گوری میم ان کی داسی نہیں بنتیں!

ایسے ہی ایک بھوگی بابا کے پرم بھکت ہیں ہمارے ایک دوست اور انکی فیملی۔ سال میں ایک بار بابا ضرور نینیتال آتے ہیں اور ہمارے دوست صاحب..... اپنا کام دھندا چھوڑ کر..... ہفتے بھر کے لئے بابا کی مہمان نوازی میں لگ جاتے ہیں۔ بابا ان کے بنگلے میں رکتے ہیں۔ تیسرے محلے کے تمام کمرے بابا اور انکے چیلوں کے لئے مخصوص ہے۔ سارے کمرے مکمل فرنیشڈ اور اے سی کے ساتھ ساؤنڈ پروف ہیں۔ ہمارے دوست کے یہاں دولت کی

کے رسالے ومیگزین تو دور لوگ دو روپئے خرچ کر کے اردو اخبار نہیں خریدتے (پانچ روپئے میں انگریزی نیوز پیپر ضرور خریدتے ہیں کیونکہ وہ..... دیسی بدیسی ست رنگی اور ادھ ننگی تصویروں سے پُر ہوتی ہیں)..... تو میرا مجموعہ خریدیگا کون؟؟؟

مگر میں اپنے دل میں چھپے دیرینہ ارمان کو..... حسرت میں بدلتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اردو کی محبت کے آگے..... دل جیت گیا اور دماغ ہار گیا۔ میں نے ٹھان لیا کہ کوئی کچھ بھی کہے میں یہ رسک ضرور اٹھاؤنگا اور اپنا مجموعۂ کلام ادب نواز دوستوں کی خدمت میں پیش کرونگا۔ اسکے بعد میں نے اپنا مسودہ کئی ایک مشاہیر ادب کے پاس بطور تبصرہ روانہ کیا۔ ان سے گزارش کی کہ یہ میرا پہلا مجموعہ ہے، اپنے تاثرات سے نوازیں تو میں اسے شامل کتاب کرلوں۔ مگر بیشتر ادیبوں نے محبت کے ساتھ معذرت کرلی۔ وجہ اللہ بہتر جانتا ہے!

مگر میں انتہائی شکرگزار ہوں ..... اُستاد محترم جناب بیکلؔ اتساہی صاحب اور ڈاکٹر مناظر عاشقؔ ہرگانوی صاحب کا جنھوں نے میری بھرپور حوصلہ افزائی کی اور پہلی فرصت میں ہی میرے لئے مضمون لکھ دیا۔ میں دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں برادرم جناب ڈاکٹر بلند اقبال صاحب (کینیڈا)، جناب سہیل احمد صدیقی صاحب (پاکستان)، جناب رضی الدین رضؔی صاحب (پاکستان)، ڈاکٹر امامؔ اعظم صاحب اور میرے عزیز دوست جناب سمنؔ نسیمی صاحب کا کہ جنھوں نے میری گزارش کی لاج رکھ لی اور اپنی ڈھیروں مصروفیات کے باوجود میرے لئے مضمون لکھ کر مجھے اپنی محبتوں کا قرضدار بنا دیا۔

ویسے مجھے آپ کی رائے اور مشورے کا انتظار رہیگا۔ خدا حافظ!

طالبِ دعا

منیر ارمان نسیمی

بھدرک، اڑیسہ، انڈیا

ریل پیل ہے (ہمارے دوست کی فیملی اسے باباجی کا کرشمہ کہتی ہے مگر اتفاق کی بات ہے کہ بابا جی سے ملنے کے بعد ہی دوست صاحب کا کاروبار چل نکلا)۔ باباجی کے کھانے پینے کے لئے چاندی کے برتن آرڈر دیکر بنائے گئے ہیں۔ باباجی کے آرام کا پورا بندوبست کیا گیا ہے۔ ہفتہ دس دن کے لئے باباجی آتے ہیں، اپنے تمام بھکتوں سے وہیں ملتے ہیں..... خوب دعوتیں ہوتی ہیں مگر..... باباجی رات کا کھانا ہمارے دوست کی فیملی کے ساتھ کھاتے ہیں کیونکہ ہمارے دوست ان کے خاص چیلے ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد پوری فیملی باباجی کے گرد ڈیرا جمالیتی ہے اور وہ اپنی جھوٹی کرامات بیان کرتے ہیں کہ..... کس ملک میں کس چیلے کا برسوں سے اٹکا ہوا ٹینڈر چٹکی بجاتے ہی پاس کروادیا..... کہاں کس چیلی کی جوان بیٹی کو کینسر سے مکتی دلادی..... مرگی کا دورا ہاتھ لگاتے ہی کیسے دور کردیا وغیرہ وغیرہ۔ بدیسی چیلے باباجی کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں۔ گھنٹہ بھر بعد باباجی آرام کرنے کے لئے اپنے بیڈروم میں چلے جاتے ہیں۔ ان کی خدمت کے لئے کبھی ہمارے دوست کی بھابی..... کبھی بیوی تو کبھی بیٹی جاتی ہیں۔ گھنٹے دو گھنٹے بابا کی خدمت کرنے کے بعد جب بابا سو جاتے ہیں تو یہ واپس آتی ہیں۔ ہمارے دوست کو بابا کے خاص چیلے ہونے کے باوجود اپنی بیوی کا باباجی کی خدمت میں گھنٹوں لگے رہنا پسند نہیں۔ کبھی کبھی جب بابا کو نیند نہیں آتی ہے تو پوری رات نکل جاتی ہے اور بیچارے دوست صاحب بستر پر بیوی کے انتظار میں کروٹیں بدلتے رہ جاتے ہیں۔ مگر بابا کے کرودھ اور ان کی شراپ سے دولت کے چھن جانے کا ڈر انھیں زہر کے گھونٹ پینے پر مجبور کردیتا ہے۔ غریبی اور مفلسی کی زندگی نرک سمان ہوتی ہے۔ اس لئے سب جان بوجھ کر بھی ہمارے دوست صاحب..... چُپ رہتے ہیں۔ مگر اس دن وہ چپ نہیں رہ سکے جب ان کی چھوٹی بیٹی نے جو دسویں جماعت میں پڑھتی ہے..... باباجی کی خدمت کرنے سے انکار کردیا۔ وہ اپنی بیٹی پر برس پڑے۔ لیکن جب ان کی بیٹی نے لاکر اپنے خون سے سنے شلوار دکھائے تو.....؟؟؟

ایسے اشتہاری بھوگی باباؤں کی تعداد..... دن بہ دن بڑھ رہی ہے۔ کچھ ایک بابا تو

اتنے اثر رسوخ والے ہو چکے ہیں کہ پولس اور قانون کو اپنے گھر کی داسی سمجھتے ہیں۔ ملک کے سربراہ، وزیر، آفیسر وغیرہ ان کے در پہ ماتھا رگڑنے آتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اندھ وشواس صرف جاہلوں میں ہوتی ہے۔ تو پھر ہمارے سماج کے اعلیٰ تعلیم یافتہ..... کیمبرج اور آکسفورڈ سے لوٹے..... سیاست داں، آفیسرز کیا کرتے ہیں باباؤں کے دربار میں؟؟؟ کچھ ایک بھوگی بابا تو اتنے دولت مند ہو چکے ہیں کہ ان کے ذاتی ہیلی کاپٹر اور ہیلی پیڈ ہیں، سوئز بینک میں اکاؤنٹ ہے، امریکہ اور انگلینڈ میں پراپرٹی۔ ہمارے ایک کالج فیلو کے انکل جی بھی اسی طرح کے چمتکاری بابا تھے (جواب مرنے کے بعد شاید نرک کے جمعدار ہو گئے ہونگے)۔ ان کی ملک کے کونے کونے میں شہرت تھی، بڑے ہی جلالی مشہور تھے۔ صرف مرے ہوئے کو زندہ نہیں کر سکتے تھے ورنہ..... کونسا ایسا کام تھا جو وہ نہیں کر سکتے تھے؟ انھیں دنوں رزلٹ آیا تو ہمارا وہ دوست فیل ہو گیا۔ ہم سب کو بہت دکھ تھا مگر وہ..... بالکل شانت تھا۔ ہم کو دکھی دیکھ کر بولا..... ''ڈونٹ وری یار! اپنے انکل سے کہہ دونگا تو..... پاس ہو جاؤنگا''۔ اور آپ یقین کریں..... وہی ہوا بھی، وہ پاس ہو گیا اور تھرڈ ائیر میں ہمارے ساتھ کلاس کرنے لگا۔ آجکل وہ چیف سکریٹری لیول کا آفیسر ہے۔ تب ہم اس کے انکل کو چمتکاری بابا ماننے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ہمارے اسی دوست نے ہمیں یہ راز کی بات بتائی تھی کہ..... اسکے انکل جی بابا بننے سے پہلے، اپنے شہر کے لوفر لفنگے، غنڈے بدمعاشوں کی ایک ٹولی کے سربراہ تھے۔ اتفاق سے ایک بار ہری دوار پکنک پہ گئے تھے، وہاں سے لوٹے تو بابا بن گئے۔ دادا گیری چھوڑ کر..... بابا گیری چالو کر دی اور خوب کمانے لگے۔ انکل جی بن گئے بابا جی تو ان کے لوفر لفنگوں کی ٹولی بھی کام سے لگ گئی۔ بابا جی سب کو پال رہے تھے۔ جب ہم نے پوچھا کہ کیوں؟ بابا جی کو غنڈے بدمعاشوں سے کیا کام؟ تب ہمارے دوست نے ہمیں سمجھایا کہ..... فرض کرو تمہارے ڈیڈی آئے میرے انکل جی یعنی کہ بابا جی کے پاس کہ ان کا پروموشن نہیں ہو رہا ہے۔ ان کا باس ان سے خار کھاتا ہے، ان کی فائل کو دبائے بیٹھا ہے۔ بابا آپ کچھ کریں۔ چمتکاری بابا نے سب سننے کے بعد آنکھیں موند لیں..... دھیان میں چلے گئے..... بھگوان

سے لَو لگانے لگے (اور دل ہی دل میں حساب بھی لگانے لگے)۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھول کر رعب دار آواز میں بولے..... ''پندرہ ہزار خرچ ہونگے..... سنی کو ہٹانے کے لئے یکیہ کرنا پڑیگا۔ اگر ایک ہفتے کے اندر تمہارا پروموشن نہیں ہوا تو ہم اپنی مونچھیں صاف کروادینگے''۔ بابا کا چیلنج سن کر تمہارے ڈیڈی فوراً روپیہ نکال کر دیدینگے۔ میرے انکل جی (باباجی) نے اپنی غنڈے منڈلی کو بھیج کر تمہارے ڈیڈی کے باس کی مرمت کروادی اور یہ دھمکی بھی دے آئے کہ..... ''اگر دو دن کے اندر پروموشن نہیں ہوا تو تمہاری بیٹی کو سرِ بازار..... یا تمہارے اکلوتے بیٹے کے اتنے ٹکڑے کرینگے کہ گن نہیں سکو گے''۔ اب تم ہی بتاؤ کہ کون ایسا جیالا ہوگا جو معمولی سے ایک پروموشن کے لئے اپنی خاندانی ناک کٹوائیگا یا اپنے بیٹے کو مروائیگا؟؟ مطلب یہ ہوا کہ تمہارے ڈیڈی کا کام دو دن میں ہوگیا۔ میرے انکل چمتکاری بابا ہیں یہ بھی ثابت ہوگیا۔ اب تمہارے ڈیڈی باباجی کے پکے بھکت ہوگئے اور اپنے دوست احباب میں ان کی کرامات کا اشتہار بانٹنے لگے۔

اسی طرح کے شعبدے دکھاتے رہتے ہیں یہ اشتہاری بابا لوگ اور بھولی بھالی عوام کو لوٹتے رہتے ہیں۔ کسی پاور فل وزیر کی بیوی کا، کسی منسٹر کی بیٹی کی خرافات کا راز اپنے جاسوسوں کے ذریعہ حاصل کرلیتے ہیں اور پھر اس منسٹر اور وزیر کو بلیک میل کرنے لگتے ہیں۔ وہ بیچارہ..... مرتا کیا نہیں کرتا..... اپنی کرسی بچانے کے چکر میں ان بھوگی باباؤں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن جاتا ہے۔ باباجی کسی کو انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ میں نوکری کروادینے کی تعویز..... ایک لاکھ میں بانٹتے ہیں اور ادھر منسٹر کو فون کرکے دھمکاتے ہیں کہ اگر اس کو نوکری نہ ملی تو.....؟؟؟ یعنی کہ دونوں طرف سے فائدہ ہی فائدہ۔ ادھر منسٹر کی بیوی یا بیٹی کو بھی اس کا راز فاش کردینے کی دھمکی دیکر اپنی خدمت کے لئے بلا لیتے ہیں۔ عوام جب یہ دیکھتی ہے کہ ان کے رہنما، ان کے نیتا جی فلاں باباجی کے پاؤں دھوکر پی رہے ہیں تو وہ بھی وہی کرتی ہے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے اور شاید چلتا ہی رہیگا۔ ہم کب تک بیوقوفوں کی جنت میں رہیں گے؟ ہم کب سمجھیں گے کہ وہ ہمیں لوٹ نہیں رہے بلکہ ہم خود انکے پاس جاکر خود کو لُٹا رہے ہیں۔ آخر

کب یہ بات ہماری سمجھ میں آئے گی کہ..... جو کچھ بھی مصیبت اور پریشانی ہمارے اوپر آتی ہے وہ ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ بھگوان یا خدا صرف اعمال دیکھتا ہے اور اچھے کرموں کے اچھے پھل دیتا ہے اور برائی کا بدلہ برا ہی ہوتا ہے۔ یہ دکھ، درد، رنج وغم اور پریشانی..... اپنے لئے ہم خود ہی کماتے ہیں!

بابا لفظ اتنا مقدس ہے کہ اسے ہونٹوں سے ادا کرتے ہی دل کے احساس نرم ہو جاتے ہیں۔ صحیح معنوں میں بابا وہ ہوتے ہیں جنھیں دیکھ کر..... نظریں جھک جائیں اور دل خود بہ خود اللہ اللہ کرنے لگے۔ چوتھے قسم کے بابا یعنی کہ یوگی بابا اسی ٹائپ کے ہوتے ہیں۔ جو..... پیر، فقیر، سنت، سادھو یا مہاتما کہلاتے ہیں۔ یہ بابا لوگ دنیا کو تج دیتے ہیں، عوام سے دور بھاگتے ہیں مگر دنیا ان کے پیچھے بھاگتی ہے۔ یہ اللہ والے ہوتے ہیں۔ انھیں صرف اللہ سے مطلب ہوتا ہے..... کسی شاہ، وزیر کے در پہ نہیں جاتے نہ جاہ وحشم کی طلب ہوتی ہے۔ عیش وعشرت تو دور..... یہ ضروریات زندگی جیسے روٹی، کپڑا اور مکان کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔ جو مل گیا کھالیا، نہیں ملا تو شکر الحمد اللہ۔ ہمیشہ اپنے رَب کی ثنا کرتے رہتے ہیں۔ اپنے، بیگانے، دوست، دشمن، بیوی، بچے کسی کی پرواہ نہیں ہوتی۔ ایک خدا کی پرواہ کرتے ہیں جو ان کی پرواہ کرتا ہے۔ پربھو کے گُن گاتے ہیں، سب کی بھلائی چاہتے ہیں اور یہی بابا لوگ آگے چل کر..... چشتی، نانک یا کبیر کہلاتے ہیں!

☆☆☆

With Best Compliments from:

Noble *Ads.*

Contact for English, Hindi, Urdu, Oriya DTP, Screen printing, Offset Printing, especially Books and Calenders

Near Head Post Office, Main Road, Bhadrak-756100 [Orissa]

Mobile: +9337610780, +9337611780, +9338483341, Ph.: 06784-251286

رانگ نمبر

آج شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جہاں فون نہ ہو۔ ٹیلی فون یا پھر موبائل فون کی وجہ سے جہاں رشتے بڑھنے لگے ہیں وہیں درد کم سے کم تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اب نہ وہ دوری کا غم ہے نہ جُدائی کا درد۔ جیب میں موبائل ہے تو پھر کیا غم ہے۔ جب جی چاہا دبا دیا..... گھنٹی بج گئی..... محبوب لائن حاضر! ہنس لو، گا لو، باتیں کر لو..... پھر دبا دو..... موبائل آف..... محبوبہ غائب!! گویا کوئی جادوئی جن ہاتھ لگ گیا ہے۔ پوری دنیا سمٹ کر ایک ڈبے میں آ گئی ہے..... کر لو دنیا مُٹھی میں!!

دنیا کی ہر ایجادات کی طرح فون کے بھی جہاں ہزاروں فوائد ہیں وہیں کروڑوں نقصانات بھی ہیں۔ جتنی سہولت ہے اتنی الجھنیں بھی ہیں۔ زندگی سے سکون نام کی چڑیا اُڑ گئی ہے۔ اس موبائل کی وجہ سے کہیں بھی آدمی چین و سکون سے رہ نہیں سکتا۔ ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کی بات کیا، اب تو موبائل باتھ روم تک بھی جا پہنچی ہے۔ یہ تو ایسی ایسی جگہوں پہ بول اٹھتی ہے کہ کیا بتاؤں.....؟ اگر بیوی ہوتی تو آدمی طلاق طلاق طلاق چلّا اُٹھتا مگر ہائے رے بے بسی کہ غصّے میں اسکو پٹک بھی نہیں سکتے کہ دوبارہ پھر گلے لگانا پڑیگا..... اسکے بغیر جینا مشکل ہے۔

موبائل اور فون کی سب سے عام خامی ہے غلط نمبر کا لگ جانا..... رانگ نمبر۔ اسکے بعد کراس کنکشن۔ آپ اپنے لنگوٹیا یار کو نمبر لگائیں گے اور لگ جائیگا پولس اسٹیشن یا فائر بریگیڈ کو۔ محبوبہ روٹھ گئی ہے، منانے کے لئے کال کریں تو کسی نک چڑھی بڑھیا سے تو تو میں میں ہو جاتی ہے۔ سکریڑی کی خیریت دریافت کرنے کے لئے نمبر گھماؤ تو پتا نہیں کیسے بیوی فون پہ غرّانے لگتی ہے۔

ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ میں صبح سے اپنے باس کو فون لگا رہا ہوں مگر ہر بار فون ''نیٹ ورک بزی'' میں پھنس جاتا ہے۔ پہلے ہم ٹرافک جام میں لیٹ ہو جاتے تھے اب ہوائی ٹرافک بھی جام ہونے لگی ہے۔ یہ ٹرافک دکھائی نہیں دیتی مگر..... اتنا بے چین کر دیتی ہے کہ آدمی تلملا کر رہ جاتا ہے۔ میں اپنے باس کو ایک ضروری فون کرنا چاہتا تھا کہ مجھے آج چھٹی چاہئے مگر موبائل تھی کہ لگتی نہیں تھی۔ میں کم از کم سو بار ٹرائی کر چکا تھا اور میرا ٹمپریچر دو سو پار کر چکا تھا کہ میرا موبائل گنگنا اٹھا۔ میں دوڑ کر گیا کہ ہو نہ ہو باس کا ہی فون ہو، اتنی دیر ہو گئی آفس کیوں نہیں آئے تو میں ان سے کہہ کر چھٹی لے لونگا۔ مگر واہ ری قسمت، کوئی انجان نمبر سے کال تھا، میں نے وصول کیا تو ادھر سے کوئی ،رواڑی..... بنا سلام دعا کے شروع ہو گیا..... ''کیا گپتا جی! مزاق کر رہے ہیں ہمارے ساتھ..... مال کیوں واپس کر دیا..... کتنے کا نقصان ہو گیا۔ اب اسے کون بھریگا؟''۔

میں نے کہا..... ''بھائی میری بات تو سنو میں گپتا جی.....''۔

''کچھ نہیں سننا ہے مجھے۔ آپ کو پتہ ہے ایک ٹرک مال لوڈ کرنے اور بھدرک لے جا کر واپس لانے میں میرا دس ہزار کا نقصان ہے۔ کون بھریگا؟ میرے پاس کوئی حرام کا پیسہ جمع ہے۔ مال لینے کا نہیں تھا تو آرڈر کیوں دیا تھا؟ تم بھدرک والے بیوپاری نہیں چمار ہو۔ میں آپ کو نہیں چھوڑونگا گپتا جی۔ میرا نام رادھے شیام اگروال ہے، یاد رکھنا..... اب ہماری ملاقات کورٹ میں ہوگی''۔

ایک تو میرا ٹمپریچر پہلے ہی بہت ہائی چل رہا تھا اوپر سے یہ اگروال کا بچہ میری بات ہی نہیں سن رہا تھا کہ میں گپتا جی نہیں ہوں۔ اوپر سے رانگ نمبر پر دھمکی پہ دھمکی دئے چلا جا رہا تھا۔ میں نے ایک پل میں سوچ لیا کہ اس کو مزہ چکھانا پڑیگا۔ میں گپتا جی نہ ہوا تو کیا ہوا، بھدرک والا تو ہوں اور یہ کم بخت بنا سوچے سمجھے بھدرک والوں سے پنگا لے رہا ہے۔ میں نے اپنی آواز میں تھوڑی سی مٹھاس زبردستی بھرتی کی اور کہا..... ''ارے اگروال جی مہاراج..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں تو آپ کے ٹرک کے انتظار میں صبح سے سوکھ رہا

ہوں۔ مال کا ڈیمانڈ اتنا ہے کہ میں ابھی آپ کو فون کرنے والا تھا کہ مجھے ایک ٹرک نہیں بلکہ..... پانچ ٹرک مال چاہئے۔ بھاؤ میں اگر دس پانچ کی بڑھوتری بھی ہوگی تو چل جائیگا۔ مگر آپ کا ٹرک تو آیا ہی نہیں۔ لگتا ہے کسی اور گپتا جی کے پاس چلا گیا ہوگا اور انہوں نے منع کر دیا ہوگا''۔ پانچ ٹرک مال کا سن کر ادھر اگروال جی ایک دم چھاچھ کی طرح بیٹھ گئے اور ملائم آواز میں بولے..... ''گپتا جی، لگتا ہے میرا ڈرائیور سالا نشے کی حالت میں کسی اور گپتا سے مل آیا ہے۔ کوئی بات نہیں بھایا۔ میں ابھی پانچ ٹرک مال لوڈ کروا دیتا ہوں۔ صبح سویرے نکل پڑیں گے تو شام تک آپ کو مال مل جائیگا۔ اور ہاں ابھی جو مال واپس آیا ہے اس کا کرایا ہم آپس میں ایڈجسٹ کر لینگے۔ نفع بھی برابر ہو تو نقصان بھی برابر برداشت کرنا پڑتا ہے۔ دھندے کی بات ہے گپتا جی..... آپ سمجھ رہے ہیں نا''۔

میں نے دل میں کہا..... ''بیٹا میں تو سمجھ گیا ہوں۔ اب تمہارے سمجھنے کی باری ہے۔ جب کل شام تمہارے پانچ ٹرک آ کے واپس جائینگے تو ایک کا دس ہزار کے حساب سے پچاس ہزار کا نقصان تمہیں ضرور سمجھا دیگا کہ..... کسی سے فون پر بات کرنے سے پہلے یہ تسلی ضرور کر لینا چاہئے کہ نمبر صحیح لگا ہے یا نہیں!''

ایک دوسرا فون ملاحظہ کیجئے!

''ہیلو..... میں ابھی کچھ دیر میں پہنچنے والا ہوں۔ ٹرین سے بول رہا ہوں۔ ایک دو دن کا کام ہے مگر ایک ہفتے کی چھٹی لے کر آیا ہوں۔ خوب عیش کریں گے۔ تم فری ہو نا؟ تمہارے صاحب جی کب واپس آ رہے ہیں امریکہ سے؟ اکیلے اکیلے کیسے جی لیتی ہو یار؟ تم یہاں اور وہ وہاں..... پتہ نہیں کسی گوری میم کی آغوش میں پڑا ہوگا۔ ارے کیا سوچ رہی ہو..... جب سوچنا تھا تب تو نہیں سوچا۔ چپ کیوں ہو؟ کچھ بولو، جواب دو..... میں ہوٹل اشوکا میں ٹھہرونگا..... آؤ گی نا مجھ سے ملنے؟؟''

''سوری انکل! آپ تو نان اسٹاپ بولتے چلے جا رہے ہیں۔ مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ آپ کون بول رہے ہیں؟'' اُدھر سے آواز آئی۔

''کیا یہ چاندنی چدمبرم کا گھر نہیں ہے؟'' صاحب سنگھ نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

''یس انکل..... یہ ممی کا ہی نمبر ہے مگر آپ کون ہیں؟ ممی پاپا تو ساتھ باہر گئے ہیں آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟؟'' ۔اُدھر سے آواز آئی۔

اور اِدھر چھ فٹ کے ہٹے کٹے صاحب سنگھ جی..... ٹرین کے اے سی کمپارٹمنٹ میں بھی پسینے میں نہا گئے۔ ادھر سے ہیلو ہیلو کی آواز آتی رہی مگر ادھر صاحب سنگھ جی اپنی جگہ سے ہلنے کے بھی قابل نہیں تھے۔ سوچ رہے تھے کہ یہ کیا کر دیا میں نے..... ماں کا سمجھ کر بیٹی سے وہ سب باتیں کر گیا جو..... کسی عزت دار آدمی کے لئے ڈوب مرنے کے لئے کافی ہے۔ چاندنی واپس آئے گی تو اسکی بیٹی اسکو بتائیگی..... ہوسکتا ہے اس کا پتی بھی سامنے ہو اور وہ کیا سوچے گا؟؟ شاید وہ موبائل فون کا کال ریکارڈ دیکھے گا۔ پھر میرے نمبر پہ کال کریگا..... اسکے بعد.....؟؟؟ صاحب سنگھ جی اس سے آگے کچھ اور سوچ نہیں پائے۔ موبائل سے سیم کارڈ نکالا اور باتھ روم جا کے اس کو فلش میں ڈال آئے۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری!

ایسا نہیں ہے کہ موبائل فون سے صرف گھر برباد ہوتے ہیں، نوجوان بچے برباد ہوتے ہیں بلکہ اس موبائل کی وجہ سے میرے ایک پچاس اوپر کے رنڈوے دوست..... خانہ آباد بھی ہوئے۔ اور ابھی اپنے اور اپنی پتنی کے کل چھ عدد بچوں کے اکلوتے پتا جی کہلاتے ہیں اور فخر سے سینہ پھلاتے ہیں۔ مگر اتنے احسان فراموش ہیں کہ ایک بار بھی میرا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اور نہ کبھی اپنے گھر دعوت دی۔ ہوا یوں کہ مجھے اکثر و بیشتر ایک مخصوص نمبر سے رانگ کالس آتے تھے۔ کوئی محترمہ تھیں جو اپنے کسی رشتے دار یا دوست کو کال کرتی تھیں مگر ایک آخری نمبر کی گڑبڑی کی وجہ سے وہ کال مجھے آلگتی تھی۔ یوں دھیرے دھیرے وہ رانگ کالس میرے لئے رانگ نہیں رہے۔ میں نے اس نمبر کو محفوظ کر لیا اور اکثر ان سے دو چار باتیں بھی کر لیتا تھا۔ مجھے اس خاتون نے بتایا کہ وہ بیالیس سال کی حسین عورت ہے (ہر عورت اپنے آپ کو خوبصورت

کہتی ہے، اس میں عمر کی کوئی قید نہیں)۔ ان کے شوہر کا انتقال پر ملال ہو چکا ہے مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ مرتے مرتے بھی بیوی بچوں کو مالا مال کر گئے ہیں۔ لاکھوں روپے کی انشورنس پالیسی اور ان کے مرنے کے بعد ان کی جگہ ان کی نوکری بھی سونپ گئے ہیں۔ اب وہ خاتون شہر کے نامی ویمنس کالج کے ہاسٹیل کی وارڈن ہیں۔ چاروں بچے اچھے بورڈنگ اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ ان کو تنہائی کاٹنے کو دوڑتی ہے تو وہ اپنے ایک دوست کو فون کرتی ہیں جو بدقسمتی سے میرے کو لگ جاتی ہے۔ بیالیس سال کی عورت کو اگر چھ کا ہندسہ نو لگنے لگے تو مجھے حیرت نہیں ہونی چاہئے۔

میں نے ان سے کہا..... ''سنگیتا جی! کوئی بات نہیں۔ آپ چاہیں تو مجھے بھی کال کر سکتی ہیں اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتی ہیں۔ میرا پرسنل نمبر لے لیجئے، مگر پلیز دن کے وقت فون نہ کریں کہ میں آفس میں ہوتا ہوں''۔ جب انہوں نے میرا نمبر مانگا تو میں نے پتہ نہیں کیوں..... اپنے انھیں رنڈوے دوست کا موبائل نمبر دیدیا (اللہ مسب الاسباب ہے، وہ جو کرتا ہے بندوں کے اچھے کے لئے کرتا ہے)۔ ادھر لانچ بریک میں میں نے اپنے دوست کو بھی کہہ دیا کہ یار میں نے تیرے لئے ایک ٹائم پاس ڈھونڈ لیا ہے۔ وہ چہک اُٹھے بولے..... کون ہے، کہاں ہے، جلدی ملانا اُس سے۔ میں نے کہا..... بھائی صاحب، اتنی بے صبری بھی ٹھیک نہیں۔ ذرا اپنے کنپٹی کے سفید بالوں کا بھی خیال کرو۔ اور اگر اُن سفید بالوں کو بنا آئینے کے دیکھ نہیں سکتے تو کم از کم اپنے دونوں بیٹیوں کا خیال کر کے یہ نوجوانوں جیسے اچھلنا کودنا بند کرو۔

وہ تلملا گئے اور بولے..... ''اچھا اچھا ٹھیک ہے، لکچر دینا بند کرو۔ تم کیا جانو رنڈوا ہونے کا دُکھ؟ جب تم ہو گے تب تم میرے درد کو سمجھو گے''۔ میں نے کہا..... ''ٹھیک ہے بھئی! یہ بات ذرا میری گھر والی سے کہہ دینا، شاید وہی مجھے رنڈوا بنانے میں تمہاری مدد کر دے''۔ جب ان کو میری بات سمجھ میں آئی تو جھینپ گئے اور بولے..... ''ٹھیک ہے یار، تم جلدی بتاؤ وہ فون والی بات۔ میں نے ان کو تمام باتیں بتا دی اور اچھی طرح سمجھا دیا کہ جب سنگیتا جی کا فون آئے تو کیسے کیا کرنا ہے؟

مشکل سے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ میرے وہی رنڈوے دوست صاحب ہاتھوں میں مٹھائی کا ڈبہ لئے مارے خوشی کے چہکتے دمکتے چلے آرہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ شاید انکی بیٹیوں کا رزلٹ آیا ہوگا تو خوشی سے مٹھائی بانٹ رہے ہیں۔ مگر جب انہوں نے بتایا کہ ابھی ابھی وہ لوکناتھ مندر میں سنگیتا جی سے شادی کر کے آرہے ہیں تو میرے کولہے کے نیچے سے چوکی کھسک گئی۔ میں حیرت اور ہڑبڑاہٹ میں کھڑا ہوگیا۔ میں نے پوچھا کہ تمہیں اپنی بیٹیوں کا بھی خیال نہیں آیا کہ وہ کیا سوچیں گی؟ تو وہ صاحب بولے..... ''ارے یار، ہم بیکار میں آجکل کے بچوں کو گالیاں دیتے رہتے ہیں۔ آجکل کے بچے تو اتنے انڈر اسٹینڈنگ ہیں کہ ہماری شادی..... ہمارے بچوں کی رضامندی سے ہی ہوئی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہماری شادی میں ہمارے چھ بچے ہی باراتی تھے اور سب کے سب اپنے نئے ماں باپ سے بہت خوش ہیں۔ جلدی سے مٹھائی کھالو یار..... مجھے جلدی گھر بھی پہنچنا ہے کہ ہماری ٹرین چار بجے کی ہے''۔ میں نے پوچھا کہ بھئی ابھی ابھی شادی ہوئی ہے اور تم چار بجے کی ٹرین سے کہیں جارہے ہو۔ بیچاری بھابی سہاگ رات میں تکیئے سے لپٹ کر روئیں گی۔ تو وہ جھٹ سے بولے..... ''ابے یار، میں اکیلے تھوڑے جارہا ہوں۔ ہم دارجیلنگ جارہے ہیں ہنی مون منانے..... ہم ساتھ ساتھ ہیں''۔ میں اپنا سا منھ لے کر رہ گیا اور وہ اچھلتے کودتے چلے بھی گئے۔

☆☆☆